ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

اکتوبر ۲۰۱۷ء

www.nadwifoundationaligarh.org

ایڈیٹر
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	غم نہ کرو	محمد عارف ندوی	
۲۔	اداریہ	عدل ہی مساوات کی اساس ہے	مدیر	۳
۳۔	پیام سیرت	تڑپا ہی کرے تشنۂ دیدار تمہارا	محمد فرید حبیب ندوی	۹
۴۔	خاص تحریر	علماء اور دینی خدمت گذاروں کے لئے لمحۂ فکریہ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۱۲
۵۔	احساس ذمہ داری	دنیا میں بڑھتی افراتفری اور امت مسلمہ کی ذمہ داری	مولانا اسرار الحق قاسمی	۱۷
۶۔	ماحولیات	ماحولیات کا تحفظ اسلام کی نظر میں	مولانا قمر الزماں ندوی	۲۱
۷۔	اسلامی تعلیمات	اسلام میں حقوق حیوانات	مولانا کلیم اللہ عمری مدنی	۲۸
۸۔	تاریخ کے جھروکوں سے	اورنگ زیب عالمگیرؒ-حقائق وغلط فہمیاں	محمد خالد ضیا صدیقی ندوی	۳۶
۹۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد-چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۴۲
۱۰۔	لمحۂ فکریہ	اگر اب بھی نہ جاگے تو......	مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی	۴۷
۱۱۔	فکر اسلامی	مفکر اسلام-ایک مطالعہ (قسط-۲۰)	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۵۳
۱۲۔	انکار حدیث	فتنۂ وضع کے مقابلے میں علماء و محدثین کی خدمات	محمد فرید حبیب ندوی	۵۶
۱۳۔	اصلاح حیات	عجلت پسندی قرآن و حدیث کی روشنی میں	محمد عبداللہ بن شمیم ندوی	۵۹
۱۴۔	// //	جدید انسان کی مذہب بیزاری، نقصانات اور حل	محمد شعیب ندوی	۶۱
۱۵۔	آخری صفحہ	تو میں یہ کتاب اس کے نام منسوب کرتا	م-ق-ن-	۶۴
۱۶۔	شعر و ادب	اللہ کا انکار ہے، انکار تمہارا	ابوالمجاہد زاہدؒ	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

عدل ہی مساوات کی اساس ہے

اس وقت دنیا میں مساوات کے متعلق جس قدر پروپیگنڈہ ہے افسوس ہے کہ اس پر اس قدر عمل نہیں، اور سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ مساوات وعدل کے درمیان فرق نہیں کیا جاتا جس کے سبب خلط مبحث واقع ہوتا ہے اور معاشرہ اضطراب وفساد کا شکار ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (۱) (ترجمہ: اللہ عدل وانصاف، حسن سلوک اور رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیتا ہے، اور تمام جرائم، بے حیائیوں برائیوں اور زیادتیوں سے منع کرتا ہے، وہ دل میں اترنے والی بات کہتا ہے تاکہ تم نصیحت سے فائدہ اٹھاؤ)۔

یٰٓاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا ھُوَاَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۲) (ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ کی خاطر حق پر قائم رہو، اور حق وانصاف کی گواہی دو، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں عدل وانصاف سے نہ روک دے، انصاف کرو، تقوی کے قریب یہی ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اس کا لحاظ کرتے رہو، بے شک اللہ تمہارے تمام اعمال سے خوب باخبر ہے)۔

عدل جو عام طور پر انصاف کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے، قرآن مجید میں اس کا استعمال بعض مقامات پر انصاف کے ہی معنیٰ میں ہوا ہے جبکہ بعض جگہ مساوات کے معنی کے لیے عدل کا لفظ مستعمل ہے، انصاف کے معنی میں قسط کا بھی استعمال ہوا ہے، کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور مجرد رائے سے اجتناب کرتے ہوئے جو فیصلہ کیا جائے اسے عدل کہتے ہیں، واجب حقوق کی ادائیگی اور مستحقین کے حقوق میں برابری کا لحاظ رکھنے کو عدل کہتے ہیں، امام جرجانی کے مطابق افراط وتفریط سے بچ کر درمیانی معاملہ کو عدل کہتے ہیں، شریعت میں عدل کا مفہوم ہے کہ حق پر استقامت اختیار کی جائے اور دین میں جو چیزیں ممنوع ہیں ان سے اجتناب کیا جائے۔

امام ماوردی کہتے ہیں قانون عدل ایک ایسا شامل وکامل اصول وقانون ہے جس کے بغیر دنیا کی حالت نہیں سدھر سکتی، عدل کی بنیاد پر الفت پیدا ہوتی ہے، اس سے جذبہ طاعت جنم لیتا ہے، عدل کے سبب بستیاں آباد وشاداب رہتی ہیں، دولت بڑھتی ہے، نسلیں پروان چڑھتی ہیں اور حکومتیں مطمئن رہتی ہیں۔ (۳)

بعض اہل علم کہتے ہیں کہ عدل وہ میزان ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے لئے وضع کیا ہے اور اس کو نصب کیا ہے حق کی

تحقیق کے لیے، لہذا عدل کی مخالفت کر کے اللہ کی میزان اور اس کے حکم کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے۔

دو عادتیں ایسی ہیں جن کے ذریعہ عدل کے تقاضوں کو پورا کیا جا سکتا ہے، ایک تو قلت طمع اور دوسرے کثرت ورع، اگر حرص ولالچ سے دل خالی ہے اور زہد وتقویٰ سے معمور ہے تو انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا ممکن ہے۔

انسان سے جس عدل کا مطالبہ کیا گیا ہے اس کا سب سے پہلا مخاطب وہ خود ہے، سب سے پہلے انسان کو اپنے نفس کے ساتھ، اپنے جسم، اپنی روح، اپنی صحت اور اپنے اعضائے جسمانی کے ساتھ انصاف کرنا چاہیے، دوسرے کے ساتھ عدل کا معاملہ کرنے میں بسا اوقات نوعیت بدلتی رہتی ہے، کبھی انسان کو اپنے ہم پلہ اور اپنے برابر کے انسان کے ساتھ عدل کرنا پڑتا ہے، کبھی اپنے سے بڑے کے ساتھ عدل کرنا پڑتا ہے اور کبھی اپنے سے چھوٹے کے ساتھ عدل کرنا پڑتا ہے۔

جہاں تک مساوات کا تعلق ہے تو مساوات کو یقیناً انسان کا بنیادی حق قرار دیا گیا ہے، لیکن عدل مساوات کی اساس ہے، بنیادی ضروریات میں سب کے حقوق مساوی ہوں گے، لیکن عدل مفقود ہو جائے گا تو معاشرے کے بڑے طبقہ کی زندگی بوجھ بن جائے گی اور ایک محدود جماعت زندگی کے تمام وسائل پر قابض ہو جائے گی، اسلامی تعلیمات میں بلاشبہ مساوات پر زور دیا گیا ہے، چنانچہ قرآن مجید میں اس وقت یہ درس دیا گیا جب دنیا اس کے معنی ومفہوم سے ناواقف تھی، رنگ ونسل کے جھگڑوں اور خاندانی وعلاقائی تعصّبات نے انسانوں کو انسانوں کا غلام بنا رکھا تھا، اس وقت ان سب حدود کو توڑتے ہوئے قرآن مجید نے کہا:

يَـاَيُّهَـا الـنَّـاسُ اِنَّاخَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَاۗىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (۴) (ترجمہ: اے انسانو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، تم کو قوموں اور قبیلوں میں تعارف کے لئے تقسیم کیا ہے، تم میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے، بے شک اللہ سب کچھ جانتا ہے، خوب باخبر ہے)۔

حضور ﷺ کے آخری حج کا خطبہ عرفہ جس کو حقوق انسانی کا اولین عالمی منشور قرار دیا جاتا ہے، اس میں آنحضرت ﷺ نے جس طرح وحدت انسانیت کو بیان کیا ہے اور پھر اہل تقویٰ نے اپنے کردار وعمل سے جس طرح اس کی تشریح پیش کی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے، حضور ﷺ نے فرمایا تھا:

يـا ايهـا الـنـاس الا ان ربكم واحد و ان اباكم واحد الا لا فضل لعربى على عجمى ولا لعجمى علـى عـربى ولا لاحمر على اسود ولا لاسود على احمر الا بالتقوىٰ۔ (۵) (ترجمہ: لوگو! خوب اچھی طرح سن لو، تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ ایک ہے۔ خوب اچھی طرح سن لو، نہ عربی کو عجمی پر فضیلت حاصل ہے، نہ عجمی کو عربی پر، نہ گورے کو کالے پر، نہ کالے کو گورے پر، اگر کسی کو کسی دوسرے پر کوئی فضیلت حاصل ہو سکتی ہے تو صرف تقویٰ کی بنیاد پر)۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس ماحول میں جو اونچ نیچ، بھید بھاؤ، قبائلی تعصّبات، باہمی تفاخر پر اس طرح قائم تھا کہ ہر بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا رہی تھی، اس ماحول میں رسول اللہ نے تمام طرح کے احساسات برتری کو اپنے قدموں سے رگڑ دیا اور مالک حقیقی کا سب سے زیادہ لحاظ کرنے والے کو سب سے زیادہ باعزت وباوقار قرار دیا، اس پر غور کرنا چاہیے کہ عدل کرنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا: اعدلوا هو أقرب للتقوىٰ (۶) (ترجمہ: انصاف کرو، تقوی کے قریب یہی (انصاف پروری) ہے)۔

اور پھر متقی شخص کو تمام امتیازات سے پرے، سب سے زیادہ ممتاز قرار دیا گیا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عدل وانصاف کی کیا اہمیت ہے، تقویٰ سے اس کو کتنی مناسبت ہے اور عدل سے اس کو کیسی تقویت ملتی ہے کہ عدل کو حصولِ تقویٰ کا ذریعہ اور تقویٰ کے قریب تر قرار دیا گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام آیا ہی ہے عدل وانصاف کو قائم کرنے کے لئے، عدل ہی وہ چیز ہے جس پر امن عالم کا مدار ہے، اگر عدل مفقود ہوگا تو نہ کوئی گھر پرسکون ہوسکتا ہے اور نہ خاندان، عدل کے فقدان سے خاندان، قوموں اور ملکوں کے درمیان باہمی تصادم کی راہ پیدا ہوتی ہے، اسلامی تعلیمات میں سب کے حقوق جداگانہ طور پر بیان کیے گئے، ان حقوق کی ادائیگی عدل کی متقاضی ہے، عدل اگر مطلق العنان حکمرانوں کی مرضی کی بھینٹ چڑھ جائے تو سب کے اپنے حقوق تو دور بنیادی انسانی حقوق جس میں سب مساوی ہیں، رنگ ونسل اور مذاہب کی کوئی تفریق جہاں روا نہیں رکھی گئی، ان کی ادائیگی بھی مشکل ہی نہیں ناممکن ہوجاتی ہے، موجودہ حالات میں جو سب سے بڑی پریشانی دامن گیر ہے وہ یہ کہ جہاں مساوات کا مظاہرہ ہونا چاہیے مثلاً غذا، دوا، صحت و روزگار اور تعلیم وغیرہ وہاں تحفظات وتعصّبات کی پالیسیاں اپنائی گئیں، رنگ ونسل اور مذہبی وعلاقائی تعصّبات کو بنیاد بنایا گیا، یہاں مساوات کو برتنے کی ضرورت تھی تو مساوات کیا، انصاف بلکہ انسانی رواداری کو بھی بالائے طاق رکھ دیا گیا، دوسری پریشانی یہ ہے کہ جہاں عدل کی ہی ضرورت تھی وہاں بے جا طور پر مساوات کو دخل دیا گیا، عورت اور مرد، میاں بیوی، لڑکا اور لڑکی وغیرہ کے درمیان مساوات کے نعرے لگانا فضول اور معاشرتی اضطراب کا باعث ہے، یہاں اسلام نے عدل وانصاف برتنے کے واضح احکامات جاری کیے ہیں۔

دولوگوں پر جو حقوق وفرائض یکساں عاید ہوں انھیں مساوات سے تعبیر کیا جائے گا، گویا دولوگ حقوق کی ادائیگی اور واجبات کی انجام دہی میں یکساں طور پر مساوی ہیں، ابن مسکویہ نے دولوگوں کے درمیان مساوات کے وجود کی بات کرتے ہوئے ایک لطیف نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ دولوگوں میں مساوات اسی معاملہ میں ہوگا جو معاملہ دونوں میں مشترک ہو(۷)، مثلاً دو بیٹوں کے حقوق میں مساوات پر عمل ہوگا، دو بیٹیوں کے درمیان مساوات پر عمل ہوگا، دو بیویوں کے درمیان مساوات کو برتنا ضروری ہوگا، بنیادی انسانی حقوق میں بیٹے اور بیٹی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی جائے گی، لیکن تعلیم وتربیت، تقسیم میراث اور بعض دیگر امور میں ظاہر ہے کہ عدل کے تقاضوں پر ہی عمل کیا جائے گا، کیوں کہ لڑکوں کی ہیئت وکیفیت وساخت اور صنف نازک کی ہیئت وکیفیت وساخت میں فرق ہے، لہٰذا دونوں کی تعلیم میں اس کے تقاضے کو ملحوظ رکھا جانا ہی عدل ہے، دونوں کے حقوق متعین ہیں، اب میراث کی صحیح تقسیم جو متعین حقوق کے مطابق ہو عدل کی متقاضی ہے، کسی کو محروم کرنا یا یوں کہنا کہ تقسیم میں برابری ہونی چاہیے ظلم ہے، مرد وزن میں اللہ تعالیٰ نے الگ الگ خصوصیات رکھی ہیں، دونوں کی علیحدہ ذمہ داریاں طے کی گئی ہیں اور دونوں کو جسمانی اعتبار سے بھی الگ الگ تقاضے پورے کرنے کے لئے پیدا کیا ہے، قرآن مجید میں اسی کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے الرجال قوامون علی النساء (۸) واقعہ یہ ہے کہ جنس انسانی کے ان دونوں ارکان اصلی یعنی مرد وعورت کے درمیان قیام عدل کے لیے ضرورت تھی کہ دونوں کی نفسیات اور جسمانی ساخت کے اعتبار سے دونوں کے لیے الگ الگ حقوق وفرائض اور واجبات رکھے جائیں، دونوں سے مل کر جب ایک خاندان وجود میں آئے تو کسی کو نگراں، سرپرست وذمہ دار قرار دیا

جائے، یہی کام الرجال قوامون علی النساء کے ذریعہ کیا گیا، سورہ بقرہ میں اور بھی وضاحت یوں موجود ہے کہ یہ جو قدرتی فضیلت وفوقیت دی گئی وہ کہیں عدل کے تقاضوں کو پورا کرنے سے مانع نہ ہو جائے اس لیے وہاں دونوں کے ایک دوسرے پر حقوق کی وضاحت کر دی گئی اور فرمایا گیا وللرجال علیھن درجة (۹) اور پھر مردوں کے عورتوں پر حقوق کے مماثل عورتوں کے حقوق مردوں پر یوں بیان کیے گئے ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف (۱۰) اب یہ بات سمجھنے کی ہے کہ اپنے اپنے حقوق کی ادائیگی میں دونوں برابر ہیں، دونوں کے واجبات کی ادائیگی میں مساوات مطلوب ہے، اور مساوات کو برتنا ہی عدل ہے، دنیا نے مساوات کا مفہوم ہی بدل دیا اور عقل محض کی کرامت کے نتیجہ میں عدل کو پس پشت ڈال کر جب صرف مساوات کا نعرہ لگایا گیا تو عورتوں کے ذمہ مردوں کے فرائض بھی ڈال دیے گئے، نتیجہ میں نسلیں برباد ہو گئیں، خاندان تباہ ہو گئے، مغرب کی برباد زندگی کا نتیجہ سامنے ہے، یاد رکھنا چاہیے کہ مساوات کے حصول کے لئے عدل ضروری ہے، کسی کے حق میں کوئی نقص اور کوئی زیادتی نہ ہو یہ مساوات ہے، اس نقص وزیادتی سے جو چیز بچالے وہ عدل ہے، اگر عدل ومساوات کو خلط ملط کیا جائے گا تو پھر عورت ومرد کے واجبات خلط ملط ہوں گے اور عورت بھی مرد کے شانہ بشانہ چلنے کا فریب دیکھ کر اپنی نسوانیت سے ہاتھ دھو بیٹھے گی اور بے چارہ مرد عورت کے بغیر اپنی خاندانی زندگی کے سکون کو ترسے گا۔

اسلامی تعلیمات میں انسانیت کا لحاظ رکھتے ہوئے اس کی وضاحت کی گئی ہے کہ کسی کو صرف اس بنیاد پر نہیں ستایا جاسکتا کہ وہ کسی دوسرے مذہب وعقیدے کا فرد ہے، انسانیت اور انسانی کرامت کے پیش نظر رنگ ونسل اور خاندان ومذہب کا اختلاف بے معنی ہے، بنیادی انسانی حقوق سب کو یکساں حاصل ہوں گے، لیکن اس ہدف کی تحقیق وحصول کے لیے پھر ضرورت ہوگی عدل کی، گویا مساوات ایک ایسا ہدف ہے جس کو پانے کے لئے عدل کی ضرورت ہے، مساوات کا وجود قدرے مشترک میں ہوتا ہے، اور جہاں اقدار، واجبات وحقوق مشترک نہ ہوں وہاں مساوات کا نعرہ فضول ہے، بہر دوصورت اگر عدل مفقود ہے، تو معاشرے میں اضطراب کا پایا جانا یقینی ہے، گھر اور خاندان کا سکون غارت ہونا طے شدہ ہے، اس لیے کہ عدل ہی سکون واطمینان کا ضامن ہے، اسلام نے عدل کی تلقین کرتے ہوئے یہاں تک تعلیم دی ہے کہ ہر کسی کے ساتھ انصاف کیا جائے، انصاف کرتے وقت یہ نہ دیکھا جائے کہ کون کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے، مساوات وعدل کو سمجھنا ہو تو یوں سمجھی، حضرت عائشہ کی وہ مشہور روایت ہے جس میں ایک مخزومی عورت کے چوری کرنے پر حضرت اسامہ نے آنحضرت سے سفارش کی تو حضور ﷺ نے فرمایا أیم اللہ لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطع محمد یدھا باخدا اگر فاطمہ بنت محمد سے چوری سرزد ہو جاتی تو محمد اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتے، یہ جملہ مساوات پر دلالت کرتا ہے، کہ قانون سب کے لیے یکساں طور پر کام کرتا ہے، قانون کے اطلاق میں مساوات ہے، لیکن اس کا نفاذ عدل کا متقاضی ہے، اگر عدل مفقود ہوگا تو قانون کے پیمانے بدل جائیں گے، بنی اسرائیل کی اس شنیع عادت اور نفسیات کو قرآن نے تفصیل سے بیان کیا ہے، اس روایت میں بھی رسول اللہ ﷺ نے اس جانب اشارہ فرمایا ہے یا أیھا الناس، إنما ضل من کان قبلکم أنھم کانوا إذا سرق الشریف ترکوہ وإذا سرق الضعیف فیھم أقاموا علیه الحد (۱۱) اے لوگو! تم سے پہلے لوگوں کی ہلاکت کا سبب یہ ہے کہ جب ان میں کوئی شریف شخص چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور جب ان میں کا کوئی کمزور چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے۔

اگر انسان اور حکومتیں خود عدل ہیں تو گھر، خاندان اور معاشرے نیز ملک میں امن واطمینان اور سکون ہوگا، کوئی اپنے کو نقصان میں نہیں محسوس کرے گا، کوئی اپنے کو ٹھگا ہوا نہیں محسوس کرے گا، بنیادی انسانی حقوق سب کو مساوی حاصل ہوں گے، کسی کو کسی بنیاد پر کوئی انفرادیت اور فوقیت نہیں حاصل ہوگی، لیکن اگر عدل کی عادت نہ ہو، ناانصافی کا چلن ہو تو پھر نعرے اور کھوکھلے نعرے کانوں سے ٹکرائیں گے، بنیادی حقوق کے حصول کے لیے مظاہرے ہوں گے مگر ظلم وجور کے سبب بنیادی حقوق کی تقسیم میں بھی ناانصافی کی جائے گی، اس کا مشاہدہ خاندانی، معاشرتی اور قومی وملکی سطح پر ہر شخص بچشم خود کرسکتا ہے، مساوات یقیناً اچھی اور مطلوب صفت ہے لیکن وہ عدل کے تابع ہے، عدل کے بغیر مساوات ایک ایسا نعرہ ہے جس کے الفاظ خوبصورت ہیں مگر ان الفاظ کی آڑ میں ظلم وجور اور تفریق وتعصب کا ایسا بازار گرم ہے کہ ہر ہر فرد پریشان وحیران ہے، اس میں کیا شک کہ عدل ہی معاشرے اور ملک کی ترقی اور اس کے زوال کا ضامن ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہیے کہ عدل تقوے سے قریب تر اور تقرب الٰہی کا ذریعہ ہے۔

اسلام میں حکومت واقتدار کو قیام عدل کا ذریعہ قرار دیا گیا، قانون کو ایسی بالادستی دی گئی کہ اس کے بیان میں انسان کی دکھتی رگ کو بھی ملحوظ رکھا گیا اور ناانصافی کو جنم دینے والی نفسیات کی وضاحت کرتے ہوئے عدل وانصاف کرنے کا حکم دیا گیا:

یٰۤاَیُّهَاالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡاکُوۡنُوۡاقَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوۡ عَلٰۤی اَنۡفُسِکُمۡ اَوِ الۡوَالِدَیۡنِ وَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ اِنۡ یَّکُنۡ غَنِیًّا اَوۡ فَقِیۡرًا فَاللّٰهُ اَوۡلٰی بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الۡهَوٰۤی اَنۡ تَعۡدِلُوۡا وَاِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡتُعۡرِضُوۡا فَاِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرًا (۱۲) (ترجمہ: اے ایمان والو! عدل وانصاف کو قائم کرنے والے بنو، اور اللہ کی رضا کے لئے صحیح گواہی دو، چاہے وہ گواہی خود تمہارے خلاف یا تمہارے والدین یا قریب ترین رشتہ داروں کے خلاف پڑ رہی ہو، وہ مالدار ہو یا نادار، ان کا اصل حق دار تو اللہ ہے، اس لئے خواہشات اور جذبات کی پیروی میں عدل وانصاف کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھانا ہے، اور اگر تم موڑ توڑ کر یا حق سے کتراتے ہوئے اور بچتے ہوئے کوئی بات کروگے، تو اللہ کو تمہاری باتوں اور عمل کی خوب خبر ہے)۔

آج کے انسانی معاشرے کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ قیام عدل وانصاف کی تحریک چلائی جائے، ہر شخص اپنی سطح پر قیام عدل کا مسئول ہے، ألا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیته ۔(۱۳)(ترجمہ: سنو! تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور وہ اپنی ذمہ داری کے تعلق سے جوابدہ ہے)۔

اوپر مذکور آیت نیز اس مضمون کو بیان کرنے والی سورہ حدید اور سورہ مائدہ کی آیات پر نظر ڈالیے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عدل وانصاف کا قیام صرف حکومت اور اس کے شعبوں کی ذمہ داری نہیں بلکہ ہر شخص اس کا مسئول ہے، ہر انسان اس کا مکلّف و مخاطب ہے کہ وہ خود انصاف کی بنیادوں پر اپنی زندگی گزارے اور دوسروں کو عدل کی تلقین کرے، دنیا کی کوئی حکومت اور اس کی پوری مشنری اقامت عدل کی ذمہ داری اس وقت تک نہیں پوری کرسکتی جب تک تمام افراد قوم اپنی ذمہ داری کو محسوس نہ کریں، اس لیے یہ سمجھنا کہ عدل وانصاف کو قائم کرنا محض حکومت اور اس کے محکموں کی ذمہ داری ہے، فی الحقیقت بہت بڑی بھول اور نادانی ہے، وہ محکمے تو ناداں وسرکش کو درست کرنے کے لئے ہیں، اسلام نے تو اس مسئلہ کو خوف آخرت اور وجود تقویٰ سے جوڑ دیا ہے، ذرا ان آیات پر غور کیا جائے تو خوب واضح ہوگا کہ دنیا محض قانون سازی کے ذریعہ سکون واطمینان نہیں حاصل کرسکتی بلکہ عقیدے کی تلقین وتعلیم اور اس کا استحضار انسان کو عدل وانصاف پر قائم کرکے سکون واطمینان فراہم کرسکتا ہے۔

اس لیے سب سے پہلی ضرورت ہندوستانی معاشرے کے پیش نظر یہ ہے کہ عدل وانصاف سے متعلق اسلامی تعلیمات کو عام کیا جائے، برادران وطن تک عصری اسلوب میں اس کی تبلیغ کی جائے اور مسلمانوں کو ان پر عمل کے لئے ابھارا جائے، اس ضمن میں اسلامی حکومتوں میں عدل کے جو تقاضے پورے کیے گئے اور جس طرح قانونی محکموں کو برتری حاصل رہی ان واقعات کو بطور تمثیل عام کیا جائے، اسلامی ریاستوں میں جس طرح تمام اقوام کو آزادی فکر، آزادی مذہب، آزادی معاش، آزادی رہائش اور اظہار رائے کی آزادی یکساں طور پر حاصل رہی اس کی بڑے پیمانے پر نشر واشاعت کی جائے، اس کڑوی حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ اپنی عملی کمزوری کے سبب دوسروں کی طرح مسلمان بھی تقاضائے عدل کے بجائے خواہشات نفسانی پر عمل پیرا ہیں، اس لیے ایک طرف خود مسلمانوں میں آپسی بکھیڑے ہیں تو دوسری طرف غیروں سے ان کی دوریاں بڑھتی جاتی ہیں، ارشاد فرمایا گیا تھا قل ان ھدی اللہ ھو الھدی (۱۴) (ترجمہ: آپ کہہ دیں ہدایت الٰہی ہی اصل ہدایت ہے)۔ اور حکم دیا گیا تھا کہ فلا تتبعوا الھویٰ ان تعدلوا (۱۵) (ترجمہ: اس لئے خواہشات وجذبات کی پیروی میں عدل وانصاف کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھانا ہے)۔ لیکن نظر یہ آتا ہے کہ ھویٰ جو ھدیٰ کی ضد ہے، آج کا معاشرہ ہدایت الٰہی کو چھوڑ کر اسی ھویٰ کا غلام ہے، جو درحقیقت ہمارے اصل اضطراب کا سبب ہے، ہر طرح کے ظلم واستحصال سے نجات پانے کے لئے عدل سے متعلق اسلام کی روشنی اور واضح تعلیمات کو عام کرنا اور مسلمانوں کا خود ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔

حواشی:

(۱) نحل:۹۰ (۲) مائدہ:۸
(۳) نضرۃ النعیم، ج۷، ص۲۷۹۱ (۴) نضرۃ النعیم ج۷، ص۲۷۹۵
(۵) مسند احمد:۱/۴۱۱ (۶) مائدہ:۸
(۷) نضرۃ النعیم ج۷، ص۲۷۹۵ (۸) نساء:۳۴
(۹) بقرۃ:۲۳۸ (۱۰) بقرہ:۲۳۸
(۱۱) مسلم، ۱۶۸۸ (۱۲) نساء:۱۳۵
(۱۳) مسلم ج۴، رقم ۴۷۲۴ (۱۴) بقرہ:۱۲۰
(۱۵) نساء:۱۳۵

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

❑ پیام سیرت

تڑپا ہی کرے تشنۂ دیدار تمہارا

محمد فرید حبیب ندوی
12fareedamu@gmail.com

''اے نافرمان! تو میرے شہر میں آکر بھی، مجھ سے پہلے کسی اور سے ملنے جاتا ہے؟''

اسے کیا معلوم تھا کہ جسے وہ نافرمان کہہ رہی ہے، وہ فرمانبرداروں کا سردار ہے۔

وہ ہے تو اسی کے جگر کا ٹکڑا.....مگر اس کا دل کسی اور کی محبت کا گرفتار ہے۔

ہاں! وہ ہے تو اسی کا لختِ جگر.....لیکن اب اس کا پورا وجود کسی اور کی الفت کا غلام ہے۔

اس کا رواں رواں.....انگ انگ.....کسی کی آتشِ محبت میں جَل رہا ہے۔

اب وہ سارے طعنے سہہ سکتا ہے.....طنز وتعریض کے سارے تیر ونشتر انگیز کرسکتا ہے.....مگر.....کسی کے کچوکے اس کی محبت کو بے رنگ نہیں کر سکتے۔

اب اس کی آنکھوں میں نظارہ ہے تو اُسی کا.....دل میں خیال ہے تو اُسی کا.....ذہن میں تصویر ہے، تو اُسی کی.....تصور میں مورت ہے تو اُسی کی۔

اب کہنے کو تو اس کا اپنا وجود بھی ہے.....مگر کوئی کیا جانے کہ وہ کب سے اپنا وجود اس کے وجود میں گم کر چکا ہے۔

کہنے کو اس کے پاس اپنی آنکھیں بھی ہیں.....مگر کون جانے کہ اب ان سے وہ خود کچھ نہیں دیکھتا.....اس کی پتلیوں میں کسی دوسرے کی صورت قید ہے۔

یوں تو اس کی زبان بھی ہے.....اور اسے طلاقت لسانی بھی حاصل ہے.....مگر.....کوئی کیا بتائے کہ اب اس کے لبوں پہ حروف بھی کسی کی اجازت کے محتاج ہیں۔

وہ اس کی ماں تھی.....اس لئے اس کا شکوہ بجا تھا.....بھلا ماں سے بھی بڑھ کر کوئی ہوتا ہے!!

کیا ماں کی ممتا سے آگے بھی کوئی مقامِ الفت ہے؟

ماں تو ماں ہوتی ہے.....اور ماں کیا ہوتی ہے، یہ بتانے کی نہیں، محسوس کرنے کی چیز ہے.....ابھی دنیا کی کسی ڈکشنری میں ایسے الفاظ نہیں آئے، جو ماں کی ممتا کا قالب بن سکیں.....اس کی ممتا کی ترجمانی کرسکیں۔

ماں کیا ہوتی ہے.....یہ ان سے پوچھو، جن کی ماں نہیں ہوتی۔

اور ماں کو اپنے لاڈلے سے کیسی محبت ہوتی ہے.....یہ بس ماں ہی جانے.....۔

اور وہ بھی ایک ماں تھی.....اس کی زبان پر حرفِ شکایت آیا، تو اس میں تعجب کیسا؟

اس کا فرزند.....اس کا لاڈلا.....ایک عرصے کے بعد اس کے شہر میں آتا ہے.....اور اس سے ملنے کی بجائے پہلے کسی اور سے ملنے جاتا ہے۔

لوگ شاید نہیں جانتے.....اور وہ بھی نہیں جانتی تھی.....کہ دنیا میں ماں کی ممتا سے بھی بڑھ کر کوئی چیز ہوتی ہے.....مگر یہ بس قسمت والوں کو ملا کرتی ہے.....ماں تو سب کو ملتی ہے.....اگرچہ کچھ لوگ

ماں کی ممتا سے محروم رہ جاتے ہوں..... مگر ملتی سب کو ہے۔ لیکن.....وہ نعمت ہر ایک کے نصیب میں نہیں آتی۔

اور تعجب ہے ان پر..... جو اسے پانے کے بعد بھی اس کی قدر نہیں کرتے۔

ہم میں سے ہر ایک کو وہ نعمت بیش بہا حاصل ہے.....مگر.....ہم ہیں کہ اس کی قدر افزائی کی بجائے اسے نابود کرنے پہ تُلے ہیں۔

جی ہاں ..... یہ کوئی شاعری نہیں.....حقیقت ہے.....فلسفہ نہیں.....سچائی ہے.....دنیا کی سب سے بڑی سچائی.....ایسی سچائی جس سے اکثر لوگ آنکھ بند کئے ہوئے ہیں۔

محبتِ رسول اور دولتِ ایمان ..... ماں کی ممتا سے کہیں بڑھ کر ہے.....مگر لوگ اس کی قدر نہیں کرتے .....اور خیر، لوگ ماں کی ہی کب قدر کرتے ہیں.....جو ان سے شکوہ کیا جائے۔(اِلا ما شاء اللہ)۔

اسے بھی یہ نعمت حاصل تھی.....حاصل کیا معنی.....اس نے سب کچھ اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھا تھا.....ہم زیادہ سے زیادہ تصور کر سکتے ہیں.....وہ چشم دید تھا.....ہم صرف سن سکتے ہیں.....وہ محسوس کئے ہوئے تھا۔

اس کے لئے جلوۂ جاناں سے بڑھ کر کچھ نہ تھا.....وہ مریضِ غمِ جاناں تھا.....وہ بیمارِ محبت تھا.....وہ رہ رُوِ راہِ الفت تھا۔

ہر ایک جلوہ..... ایک نئے شوقِ دید کو بھڑکا دیتا.....اور ہر ملاقات.....ایک دوسری ملاقات کی پیاس لگا دیتی۔

کیا ذوق ہے کہ شوق ہے سو مرتبہ دیکھوں
پھر بھی یہ کہوں کہ جلوۂ جاناں نہیں دیکھا

کوئی ذرا اس کا حالِ دل پوچھے کہ جب اس کے محبوب نے ہی اسے خود سے دور بھیجا تھا.....اس کے دل پہ کیا گذری تھی؟

وہ جدائی کتنی شاق ہوتی ہوگی..... جو محبوب ہی کے حکم پر ہو..... وہ دوری کتنا تڑپاتی ہوگی ..... جو اشارۂ محبوب کا نتیجہ ہو.....مگر اس فراق میں جو لذت ہوگی، وہ وصال میں کہاں..... جو ہجر فرمانِ محبوب کا تابع ہو.....وہ ہجر کہاں، اس پہ تو ہزاروں وصال قربان۔

جب مدینے کا دامن دولتِ اسلام سے مالا مال ہوا، تو باشندگان مدینہ نے خدمت اقدس میں ایک معلم بھیجنے کی درخواست کی، آقا کی نظرِ انتخاب اسی پر پڑی۔

یہ انتخاب اس کے لئے پیامِ فرحت بھی تھا.....سامانِ غم بھی۔

مسرت انگیز بھی تھا.....الم ریز بھی۔

خوشی تھی تو اس بات کی کہ.....محبوب آقا کی نظرِ کرم اس پہ پڑی تھی۔

غم تھا تو اس کا کہ اس انتخاب کے دامن میں جدائی بھی لپٹ کر آئی تھی۔

اب اسے اپنے محبوب سے دور جانا تھا.....ایسی جگہ جہاں اس کی آنکھیں دیدارِ حبیب سے محروم رہتیں۔

دل تھا کہ عجیب کشمکش تھی.....دھڑکے یا تڑپے۔

آنکھیں تھیں کہ تذبذب میں تھیں.....آنسو بہائیں یا خوشی کی دیے جلائیں۔

خوشی وغم کے ملے جلے جذبات کے ساتھ وہ رخصت ہوا۔

وداعی بھی عجیب تھی.....درد وسوز.....فرحت ومسرت.....اور.....دھڑکن وتڑپ.....متضاد کیفیات کا مجموعہ تھی۔

آج اسے معلم اول کا شرف مل رہا تھا.....اب قیامت تک آنے والا ہر معلم اسی کا خوشہ چیں اور شاگرد ہوگا.....آج اسے وہ تاج پہنایا جا رہا تھا جسے خود آقا کے سر پہ سجایا گیا تھا.....اور آج اسے اپنے آقا کی جانشینی کی سوغات خود آقا کی طرف سے دی جا رہی تھی.....۔

اس نے وہاں جا کر دعوت اسلام کے ایسے نقوش ثبت کیے، جن کی تاثیر تا ابد باقی رہے گی۔

دنیا کا ہر مسلمان اس کے احسان سے گراں بار ہے۔

مختصر مدت میں ہی وہ اہل مدینہ کے دلوں میں بس گیا۔

یہ جدائی کے ایام اس نے کس انداز سے کاٹے؟.....ایک ایک پَل عذاب سے کم نہ تھا۔

یہ دن کیا تھے ؟.....درد وکسک.....حسرت والم.....رنج وغم.....حزن وملال.....انتظار وشوق۔

اس لئے جب ملاقات کا دن آیا.....مدینے سے مکہ روانگی ہوئی.....اس جگہ جہاں اس کا محبوب جلوہ افروز تھا.....تو دل شوق کے پَروں سے اڑنے لگا.....آنکھیں حسین خواب سجانے لگیں.....قدم زمین کی بجائے دوشِ ہوا پہ تھے.....وسعتِ دل یادِ حبیب میں سمٹ آئی تھی۔

اور جب وہ مدینے میں داخل ہوا تو قدم ازخود اسی جانب چل دیے .....جہاں دل پہلے ہی پہنچ چکا تھا.....ایک دل ہی کیا،.....تصور وخیال.....ذہن ودماغ.....سب کچھ وہیں تھا۔

اِدھر اس نے درِ حبیب پر حاضری دی.....اُدھر ماں کا شکوہ آ پہنچا۔

کوئی اور ہوتا تو شاید اس دوراہے پہ صفائی پیش کرتا.....کچھ گول مول بات کہتا.....مگر.....اس نے صاف کہہ دیا:

امی جان!.....آپ کی ہزار محبت کے باوجود.....میں آقا کے در سے پہلے کسی کے گھر نہیں آ سکتا.....اپنے گھر بھی نہیں۔

جذبۂ حُبِ رسول دیکھئے.....اور اس کی گہرائی کا کچھ اندازہ کیجئے۔

یہ حضور اکرم ﷺ کے چہیتے صحابی.....معلم اول.....علَم بردارِ رسول.....ہر دل عزیز ومقبول.....حضرت مصعب بن عمیرؓ ہیں۔

سابقین اولین میں سے ہیں.....بدری ہیں.....جنگ احد میں مسلمانوں کا جھنڈا انھی کے ہاتھ میں تھا.....ظالموں نے دایاں ہاتھ کاٹ دیا تو بائیں ہاتھ میں تھام لیا.....اسے بھی کاٹ دیا تو کٹی ہوئی باہوں سے تھام لیا.....مگر ظالموں کو اب بھی چین نہ آیا.....اور آپ کو شہید کر دیا۔

جس نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ محبوب کے حوالے کر دیا تھا.....آج وہ اپنا آخری لمحہ بھی اسی کے سپرد کر گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے لاش دیکھی تو آب دیدہ ہو گئے.....کفن کے لئے بس ایک چھوٹی سی چادر تھی.....سر پہ ڈالتے تو پاؤں کھل جاتے.....پاؤں ڈھکتے تو سر کھل جاتا۔

یہ حال تھا اس شخص کا .....جس کے جوڑے کی قیمت ایک زمانے میں کئی کئی سو درہم ہوتی تھی.....جس کا حال یہ تھا کہ جس گلی سے گذر جاتا.....گھنٹوں وہ گلی خوشبو سے مہکتی رہتی.....اور لوگ کہتے.....ادھر سے مصعب گذرا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سر ڈھک دو اور پاؤں کھلے رہنے دو۔

آہ.....جس نے ساری دولت .....ساری پونجی.....اسلام پر نثار کر دی.....آج اس کو پورا کفن بھی نصیب نہیں۔

مگر اے نوجوانو!.....زندگی تو اسی کی تھی.....سب کچھ کھو کر اس نے سب کچھ پالیا تھا.....کھو کر پانا کوئی اُس سے سیکھے.....آج تم دنیا کے عیش میں مگن ہو.....مگر ذرا مصعب سے تو پوچھو.....یہ عیش تو اسے بھی میسر تھا.....وہ کیوں اِسے ٹھکرا کر..... ایسی حالت میں آیا.....جہاں اسے دو وقت کی روٹی بھی میسر نہ تھی۔

کاش تم سمجھتے ! ..... جو مزہ محبوب کے لئے بھوکا رہنے میں ہے.....وہ کھانے میں نہیں۔

جو چاشنی پیاس میں ہے.....وہ سیرابی میں نہیں۔

جو لذت پھٹے پرانے کپڑوں میں ہے.....وہ قیمتی پوشاکوں میں نہیں۔

کاش تم سمجھتے .....اور.....مصعب کی زندگی سے سبق پاتے.....تم بھی اس ظاہری دنیا کو چھوڑ کر .....دل کی دنیا بساتے.....فریب سے نکل کر حقیقت کی طرف آتے..... یہ چند روزہ عیش .....جس میں تم مگن ہو..... کتنے روز کا ہے؟ ..... پھر کیا ہے؟.....فرحت ومسرت یا ناکامی وحسرت۔

مصعب نے اسی نکتہ کو پالیا تھا.....اس لئے اس نے ہمیشہ کی دولت پانے کے لئے اس چند روزہ دولت کو ٹھوکر مار دی۔

ہے کوئی جو مصعبؓ کے اس جذبۂ محبت کی پیروی کر سکے؟

افسوس!.....مسلمان تو کروڑوں ہیں.....مگر.....ان میں آج کوئی مصعبؓ نہیں۔

☆☆☆

❑ خاص تحریر

علماء اور دینی خدمت گذاروں کے لئے لمحۂ فکریہ

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اگر ہم گذشتہ چند صدیوں کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ صلیبی جنگوں کے خاتمہ کے بعد ایک دور ایسا گذرا، جب عیسائی دنیا پستی اور تنزلی کی دلدل میں پھنسی رہی، پھر جب اس وقت کی ترقی یافتہ قوم امت مسلمہ سے علم کی روشنی اسپین کے راستہ یورپ تک پہنچی تو مغرب نے ایک نئی کروٹ لی اور اس کی بیداری صنعتی ترقی کے اس عظیم واقعہ کی شکل میں ظاہر ہوئی، جس کا تسلسل اب تک جاری ہے، مغرب کی مادی اور علمی ترقی نئی نئی منزلیں فتح کر رہی ہے اور مسلسل آگے کی طرف جاری ہے اور مسلمانوں کے ادبی اور علمی زوال کی داستان بھی دراز سے دراز تر ہوتی جارہی ہے، اس ترقی کا سہارا لے کر ایک نئی صلیبی جنگ استعماریت کی شکل میں شروع ہوئی، جس نے ایشیا و افریقہ اور خاص کر عالم اسلام کے بڑے حصے کو فتح کرتے ہوئے اسے اپنی نو آبادی بنالیا، یہ استعماریت آخر اس وقت تک جاری رہی، جب تک خلافت عثمانیہ کا سقوط نہ ہوگیا اور عالم اسلام کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کامیاب نہ ہوگئی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ مسلم ممالک کو آزادی نصیب ہوئی؛ لیکن اکثر و بیشتر یہ نام نہاد آزادی تھی، ان کے گلے میں غلامی کا ایسا طوق پہنایا گیا، جو آنکھوں کو نظر نہ آئے؛ لیکن وہ صرف جسم ہی کی غلامی نہ ہو؛ بلکہ دل و دماغ کی بھی غلامی ہو، جس میں ایک قوم خود اپنے بارے میں فیصلہ کرتی ہوئی نظر آئے؛ لیکن اس کی حیثیت اس جہاز کی ہو جسے ریموٹ کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا ہے، اسی دور میں کارل مارکس نے کمیونزم کا صور پھونکا اور دنیا کے دو بڑے ممالک — روس، چین — اس نئے فلسفۂ حیات اور نظام معیشت پر ایمان لے آئے، کمیونزم سرمایہ داری کے خلاف اعلان جنگ تھا، اب دنیا میں فکری اعتبار سے تین فریق بن گئے، مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام، مشرق کا اشتراکی نظام اور اسلام، اگر چہ ان دونوں نظام ہائے حیات کو اسلام سے بغض تھا؛ لیکن چوں کہ عالم اسلام اپنی پستی اور کمزوری کی وجہ سے کمزور دشمن شمار کیا جاتا تھا؛ اس لیے اصل سرد جنگ مغربی قوتوں اور اشتراکیت کے حامل مشرقی ملکوں کے درمیان قائم رہی، اس سے ایک توازن قائم تھا، بغض وعناد رکھنے کے باوجود یہ دونوں بڑی طاقتیں مسلم ملکوں کو اپنا ہم نوا رکھنا چاہتی تھیں، اور چوں کہ سرمایہ دارانہ نظام کے حامل ممالک مذہب کی بالکل نفی نہیں کرتے تھے؛ اس لیے کمیونسٹ ملکوں کے مقابلہ میں عالم اسلام اور مسلمان مغربی قوتوں سے زیادہ قریب رہے، مغربی اقوام نے بھی یہ رویہ رکھا کہ وہ علی الاعلان کمیونزم کے خلاف تو بولتے تھے اور اپنے ذرائع ابلاغ کو بھی ان کے خلاف خوب خوب استعمال کرتے تھے؛ لیکن اسلام اور مسلمانوں کو براہ راست نشانہ بنانے میں کسی قدر رعایت سے کام لیتے تھے۔ کمیونزم کی بنیاد ایسے اصولوں پر تھی، جو پوری طرح فطرت سے متصادم

تھے؛اس لیے صرف ستر سال کے اندر ہی اس کی جائے پیدائش ہی اس کا مدفن بن گئی،اس نظام کا سب سے بڑا نمائندہ ملک اور دوسری سپر طاقت ''روس'' خود اپنی وحدت کو بچا نہیں سکا اور اس کے ٹکڑے ہوگئے، اب دنیا میں دو ہی تصورات باقی رہ گئے،ایک اسلام، دوسرے مغربی تہذیب اور مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام۔

دشمن کا مقابلہ کرنے اور کسی فکر کے تحفظ میں دو طرح کے لوگوں کا اہم کردار ہوتا ہے،ایک: حکومتوں کا،جن کے پاس فوجی طاقت ہوتی ہے، جن کے پاس مادی وسائل ہوتے ہے، جو زروزمین کی مالک ہوتی ہیں، جو ٹکنالوجی کی حامل ہوتی ہیں،اس کو وجود میں لانے اور ترقی دینے کا کام انجام دیتی ہیں اور اس کے لیے وسائل فراہم کرتی ہیں،دوسرے: وہ لوگ جو اس فکر کے ترجمان اور اس کے شارح ہوتے ہیں، جو فکری اعتبار سے اس کا دفاع کرتے ہیں، جو اپنی زبان اور قلم کے ذریعہ عوام کو اس سے وابستہ رکھتے ہیں،کسی بھی فکر کے بقا اور کسی بھی نظام کے دوام واستحکام کے لئے ان دونوں طبقوں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے،ایک کے پاس فولاد کی طاقت ہوتی ہے،دوسرے کے پاس علم کا ہتھیار ہوتا ہے،ایک نوک شمشیر سے میدان سر کرتا ہے،دوسرا زبان وقلم سے،ایک زمین کو فتح کرتا ہے اور دوسرا دل ودماغ کو۔ چنانچہ اب مشرق ومغرب کی پوری طاقت اسلام،مسلمان اور عالم اسلام کی طرف متوجہ ہے،مسلم حکومتوں کو زیر کرنے میں انھیں کچھ زیادہ دشواری پیش نہیں آئی؛ کیوں کہ خلافت عثمانیہ کے ختم ہونے کے بعد پورے عالم اسلام میں کوئی ایسی طاقت باقی نہیں رہی، جو مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے،ان کو مزید کمزور کرنے کے لئے دو خصوصی تدبیریں اختیار کی گئیں،ایک یہ کہ ان کے زیادہ سے زیادہ ٹکڑے کر دیے گئے،اتنے چھوٹے چھوٹے ممالک بنا دیے گئے کہ بعض شہر بھی ان میں سے بعض ملکوں سے بڑے ہوں گے،اس طرح ان کی طاقت ٹوٹ گئی،قدرتی وسائل بٹ گئے،افرادی وسائل کم ہوگئے اور یہ بھی کوشش کی گئی کہ ان ملکوں کو پروانہ آزادی دیتے ہوئے سرحدوں کا اختلاف باقی رکھا جائے،اس اختلاف کے ذریعہ ان کے درمیان نفرت کا بیج بویا گیا اور اسے مسلسل پروان چڑھایا گیا،آج اکثر مسلم ممالک کی یہی صورت حال ہے،سعودی عرب اور کویت اور سعودی عرب اور یمن کے درمیان سرحد کا اختلاف موجود ہے،قطر اور بحرین کے درمیان جھگڑا ہے،کویت کی عراق سے اور متحدہ عرب امارات کی ایران سے لڑائی ہے،مصر اور سوڈان کے درمیان اختلاف ہے،خود سوڈان میں عرب اور غیر عرب قبائل کے درمیان نزاع ہے،فلسطین کی چھوٹی سی نامکمل حکومت کے دو حصے بنے ہوئے ہیں،شام اور ترکی کو ایک دوسرے سے بغض ہے،کرد،عراق،ترکی اور شام سے نبرد آزما ہے،پاکستان اور افغانستان کے درمیان کدورتیں ہیں،بنگلہ دیش میں حکومت اور اپوزیشن کے درمیان معرکۂ کارزار گرم ہے،غرض شرق بعید کے دو تین مسلم ملکوں کو چھوڑ کر تمام ہی مسلم ممالک اپنے مسلمان پڑوسی ملکوں سے یا ملک کے اندر دو طبقے ایک دوسرے سے برسر جنگ ہیں۔دوسرا طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ مسلم ممالک کو حقیقی جمہوریت سے دور رکھا گیا؛ تاکہ وہاں ایسے لوگ نہ آجائیں، جو اسلام پسند ہوں اور مغربی تہذیب کے مقابلہ شریعت اسلامی کو نافذ کرنا چاہتے ہوں؛ اسی لئے انگلی پر گنے جانے والے تین چار مسلم ممالک کو چھوڑ کر تمام ملکوں میں دو طرح کے حکمراں تخت اقتدار پر مسلط ہیں،ایک وہ جو خاندانی بادشاہت کے نمائندہ ہیں، وہاں ایک خاندان کو ملک کے عوام اور اس کے وسائل کا مالک سمجھا جاتا ہے، وہ پیدائشی طور پر حکمراں ہوتا ہے،اس کی زبان قانون ہوتی ہے،عوام کی نہ حکومت میں شرکت ہوتی ہے اور نہ ان کی رائے کو کوئی اہمیت دی جاتی ہے، ہاں،اگر اس حکمراں کے اندر ذاتی طور پر اللہ کا خوف، دین کی عظمت

اور اپنے عوام کی محبت ہے تو اس کا رویہ بہتر ہوتا ہے؛ لیکن چوں کہ یہ کسی نظام کا نتیجہ نہیں ہے؛ بلکہ ایک شخص کے انفرادی اخلاق و اوصاف کا اثر ہے؛ اس لئے اس میں دوام واستمرار باقی نہیں رہتا ——دوسرے قسم کے ممالک وہ ہیں، جہاں کسی فوجی جنرل نے اقتدار پر قبضہ کیا، پھر وہ ڈکٹیٹر بن گیا اور اس کے بعد یہ ڈکٹیٹر شپ اس کی نسلوں میں منتقل ہوتی رہی، عوام کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ جمہوری طور پر ان سے نجات پاسکیں، ان کے لئے نجات کی دو ہی صورتیں ہیں: یا تو کوئی فوجی یا ظلم وستم سے عاجز شخص تشدد کے ذریعہ اس کا خاتمہ کردے، یا اللہ تعالیٰ اس کو اٹھالے، ان ملکوں کا حال بھی پہلی قسم کے ملکوں سے مختلف نہیں؛ بلکہ زیادہ بُرا ہے، ان دونوں طرح کی حکومتوں میں مغربی طاقتوں نے اپنی سازشوں کے ذریعہ اس بات کی کامیاب کوشش کی ہے کہ یہ اصحاب اقتدار ان کا کھلونا بن کر رہیں، وہ نام کے مسلمان ہوں؛ لیکن پوری طرح مغربی افکار، مغربی تہذیب اور مغربی طرز حیات کے نمائندہ ہوں، ان کی زبان حق بولنے سے خاموش رہے، ان کو ٹکنالوجی سے محروم رکھ کر بنا بنایا سامان فراہم کیا جائے، ان کے وسائل سے بھر پور فائدہ اٹھایا جائے اور پھر قرض دے کر ان پر احسان جتایا جائے، ان کے ذریعہ عوام پر ظلم وستم کئے جائیں، جو لوگ اسلام اور شریعت اسلام کا نام لیتے ہیں، انہیں دبایا جائے اور شرمناک سزائیں دی جائیں، وہ اپنی عوام کے مالک ومختار ہوں اور مغربی آقاؤں کے غلام، آج کم وبیش پورا عالم اسلام اسی صورت حال سے دوچار ہے۔ اس طویل عرصے میں مغرب کی مسلسل سازشوں اور ستم انگیزیوں کے باوجود مسلم ممالک میں بھی اور مسلم اقلیتی ممالک میں بھی جن لوگوں نے ملت اسلامیہ کو اسلام سے جوڑے رکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے اور ان کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت کی آگ کو بجھنے سے بچایا ہے، وہ وہی طبقہ ہے جو زبان وقلم کے ذریعہ اسلامی افکار کی ترجمانی کرتا ہے اور اخلاق ومحبت کی تلوار سے لوگوں کے دلوں کو فتح کرتا ہے، یہ طبقہ علماء اور دینی تحریکات کا ہے، مغرب کے استعماری دور میں ہی مسلمانوں میں اسلامی تحریکات وجود میں آنے لگیں اور انہیں فروغ حاصل ہوتا رہا، ان تحریکات کو فکر کا سرمایہ فراہم کرنے والا طبقہ علماء کا ہے، خلافت کے خاتمہ کے بعد کسی سرکاری اعانت کے بغیر اس طبقہ نے مسلمانوں کا دین سے رشتہ استوار کرنے میں جو کردار ادا کیا ہے، وہ نقش لازوال ہے، ورنہ نہ معلوم کتنے مسلمان ارتداد کا شکار ہو چکے ہوتے، دہریت اور الحاد پورے پورے ملک کو اپنے قبضہ میں لے لیتی، اسلامی شعائر کے بارے میں مسلمانوں کی دینی غیرت ختم ہو چکی ہوتی اور شریعت اسلامی سے ان کا رشتہ پوری طرح ٹوٹ چکا ہوتا، جیسے عیسائی معاشرہ میں کچھ لوگ اتوار کو چرچ چلے جاتے ہیں اور جیسے ہندو سماج میں کچھ افراد مندروں میں پہنچ کر نذر ونیاز پیش کردیتے ہیں اور کچھ خاص خاص تہواروں کو دھوم دھام سے انجام دے لیتے ہیں، یہی حال مسلمانوں کا ہو گیا ہوتا؛ کہ ان میں جو لوگ مذہبی ہوتے وہ جمعہ اور عیدین میں شرکت کر لیتے اور کبھی کبھار مسجد چلے جاتے، ان کی عائلی زندگی، ان کی معیشت اور زندگی کے دوسرے مسائل میں شریعت کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ علماء نے ہمیشہ اپنی بساط بھر امت مسلمہ کو دین سے جوڑے رکھنے اور اسلام کو اللہ کی زمین پر نافذ کرنے کی کوشش کی؛ چوں کہ ان کی یہ کوشش حکمراں طبقہ کے عیش وعشرت کے منصوبوں میں خلل انداز ہوتی تھی؛ اس لئے زیادہ تر وہ اپنے اپنے عہد کے حکمرانوں کے معتوب ہی بنے رہے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے تو قرنِ اول میں نذرانۂ شہادت پیش کردیا تھا، امام ابوحنیفہؒ کو بنوامیہ اور بنوعباس دونوں زمانوں میں حکمراں شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے، دونوں حکومتوں میں انہیں کوڑوں سے مارا گیا، قید کی سزا سے بھی دوچار ہوئے، یہاں تک کہ زہر کا پیالہ پلا کر انہیں شہید کیا گیا، امام مالکؒ کو عباسی حکمراں منصور کے

زمانے میں ستر (۷۰) کوڑے لگائے گئے اور اس طرح ان کی مشکیں کسی گئیں کہ ہاتھ بازو سے اکھڑ گئے، امام احمد بن حنبلؒ عباسی حکمراں مامون، معتصم اور واثق تینوں کے زمانہ میں ایسی شدید آزمائش سے گذرے کہ تاریخ عزیمت میں شاید اس کی مثال مل سکے، جس شخص نے امام احمدؒ پر کوڑے برسائے خود اس کا بیان ہے کہ میں نے امام احمدؒ پر اس سختی کے ساتھ اسی (۸۰) کوڑے برسائے کہ اگر اس طاقت کے ساتھ میں ہاتھی پر کوڑوں کی بارش کرتا تو وہ بھی چیخ اٹھتا اور یہ بارش مدتوں امام احمد بن حنبل پر ہوتی رہی؛ لیکن پائے استقامت میں کوئی تزلزل نہیں آیا، امام بخاری؟ کا آخری زمانہ اس حال میں گذرا کہ زمین اپنی وسعت کے باوجود ان پر تنگ ہو چکی تھی، سعید بن جبیرؒ کو اس طرح ذبح کر دیا گیا جیسے جانور کو ذبح کیا جاتا ہے؛ لیکن حجاج بن یوسف کا جبر وظلم ان کو ذرا بھی خوفزدہ نہ کرسکا، ابن السکیت کی حق گوئی پر عباسی خلیفہ متوکل نے ان کی زبان کھینچوالی اور زبان کے ساتھ ساتھ ان کی روح بھی پرواز کر گئی، خود ہندوستان میں راہِ عزیمت میں علماء کی استقامت کی ایک وسیع تاریخ رہی ہے، شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے اکبر کی دین بے زاری کے خلاف علم اصلاح بلند کیا اور پھر ایک مرحلہ ایسا آیا کہ گوالیار میں قید وبند کی صعوبتیں بھی اٹھائیں، مغل حکمرانوں کے دور میں مختلف علماء ومشائخ حق گوئی کے جرم میں شہید کردئے گئے، کسی کو قتل کر دیا گیا، کسی کو ہاتھی کے قدموں تلے روند دیا گیا، کسی کو دیوار میں چن دیا گیا اور کوئی جلاوطن کر دیا گیا، ہندوستان کی جنگِ آزادی —— جس میں علماء نے اسلام کی حفاظت کے لئے حصہ لیا —— میں بے شمار علماء شہید کردئے گئے، دلی کے مضافات میں ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں سرراہ درختوں پر پھانسی دے دے کر عبرت کے لئے علماء واہل دین کی لاشیں لٹکا کر رکھی گئیں، سید احمد شہید کی تحریک میں شامل کتنے ہی علماء صادق پور نے جام شہادت نوش کیا اور ان کے گھروں کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی، شاملی میں بڑے بڑے علماء نے سربہ کف ہوکر برطانوی فوج کا مقابلہ کیا؛ لیکن کوئی چیز ان کی ثابت قدمی کو متأثر نہیں کرسکی۔ آزمائش کا ایک دوسرا رنگ بھی ہوتا ہے اور وہ ہے مال ومتاع کا لالچ دے کر کسی کو اس کی فکر سے ہٹا دینا اور اس کو اس کے مشن سے روک دینا، امام احمد بن حنبل کے بارے میں منقول ہے کہ عباسی حکمراں متوکل نے جب پچھلے مظالم کی تلافی کے لئے امام احمد کے پاس ۲۰ ہزار سکے بھیجے اور ایک دوسرے موقع پر ایک لاکھ درہم بھیجے تو امام احمد نے معذرت کردی اور فرمایا کہ یہ آزمائش اس آزمائش سے بڑھ کر ہے: "ھذا آمر أصعب علیّ من ذلك، ذلك فتنة الدین وھذا فتنة الدنیا" محدثین وفقہاء ہوں یا اکابر صوفیاء جیسے خواجہ حسن بصری، شیخ عبدالقادر جیلانی، مشائخ ہند میں خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، خواجہ فرید الدین گنج شکر، خواجہ نظام الدین اولیاء، شیخ شرف الدین یحی منیری — رحمہم اللہ — وغیرہ ان سب کے حالات دیکھئے، یہ بادشاہوں اور حکمرانوں سے اور ان کی طرف سے ملنے والے مناصب اور نذرانوں سے اس طرح بھاگتے تھے، جیسے انسان آگ سے بھاگتا ہے۔ موجودہ حالات میں مغربی طاقتوں کی کوشش یہ ہے کہ کسی طور اس طبقہ کی لگام کسی جائے، انہیں حق گوئی سے باز رکھا جائے، غلط تاویل اور جھوٹی توجیہ کے ذریعہ مغربی افکار اور لادینی تہذیب پر ان سے مہر لگوائی جائے، اور یہ پہلے بھی ہوتا رہا ہے، ہلاکو خان نے جب بغداد کو پوری طرح قابو میں کرلیا تو اس نے اس زمانے کے بعض نام نہاد ضمیر فروش علماء سے یہ فتوی صادر کرانے میں کامیابی حاصل کرلی کہ 'عادل کافر بادشاہ' ظالم مسلمان بادشاہ سے بہتر ہے اور اس غلط فتوی کو اس نے اپنے لئے مہر تصدیق بنایا، مغرب نے اپنی اس سوچ کو روبہ عمل لانے کے لئے دو طریقۂ کار اختیار کئے، ایک طریقہ ان ملکوں میں جہاں مسلمان حکمراں ہیں یا

جہاں آمرانہ نظام ہے، وہاں ظلم اور دباؤ کا ہتھیار استعمال کیا جاتا ہے اور حسبِ ضرورت کچھ ترغیب وتحریص کا، اِس وقت اس کی زندہ مثال عرب ممالک ہیں، خاص کر مصر، جہاں شیخ الازہر اور مفتی اعظم سے مغرب کے منشا کے مطابق بیانات دلوائے جاتے ہیں، جہاں مساجد سے ان ائمہ کو معزول کر دیا گیا ہے، جو حقیقت میں اسلامی فکر کے ترجمان ہیں اور ایسے لوگوں کو اس اہم ذمہ داری پر فائز کیا گیا ہے، جن کو اس عہد کا 'منافق' کہا جاسکتا ہے، ان سے کس طرح کا کام لیا جارہا ہے اور لیا جانے والا ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہاں ائمہ مساجد کے لئے جو تربیتی ورکشاپ رکھے جارہے ہیں، ان میں انہیں ترغیب دی جارہی ہے کہ وہ عوام کو بتائیں کہ اسرائیل ہمارا پڑوسی ہے اور پڑوسی کے بڑے حقوق ہوتے ہیں، چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم، اور چاہے اس کا سلوک اچھا ہو یا بُرا؛ اس لئے اسرائیل جو بھی کرے؛ لیکن ہمیں پڑوسی ہونے کی حیثیت سے اس کے ساتھ بہتر سلوک کرنا چاہئے۔ جو جمہوری ممالک ہیں، جہاں دستوری طور پر کسی کو اپنے ضمیر کے خلاف مجبور نہیں کیا جاسکتا، وہاں مال ومتاع اور عہدہ ومنصب کا لالچ دے کر زبان وقلم پر مہر لگانے کی کوشش کی جارہی ہے، ہندوستان دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک ہے اور یقیناً جمہوریت ایک نعمت ہے، نیز مسلم آبادی کے اعتبار سے دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے، اور اس ملک کی خصوصیت علماء ومشائخ، دینی جماعتوں، تحریکوں اور تنظیموں، نیز دینی تعلیمی اداروں کی کثرت ہے؛ اس لئے یہاں ایک طرف دباؤ کی پالیسی اختیار کی جارہی ہے، مدارس، ان کے طلبہ وفضلاء، دینی تحریکوں سے وابستہ نوجوانوں اور مذہبی شخصیتوں پر انتہا پسندی، بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے الزامات لگائے جارہے ہیں اور دوسری طرف ان کے سامنے متاعِ مال وزر کی پیش کش بھی کی جاری ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ حکومت ائمہ مساجد کو معقول تنخواہیں دے گی، مساجد حکومت کے یہاں اپنا رجسٹریشن کرالیں، کبھی مدارس کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ گورنمنٹ کے قائم کئے ہوئے بورڈ میں شامل ہوجائیں، اس طرح اساتذہ کو اونچی تنخواہیں فراہم کی جائیں گی، کبھی حکومت کے غیر اہم مناصب دے کر تالیف قلب کی جاتی ہے، بہ حیثیت مجموعی ان تمام کوششوں کا بنیادی مقصد اس طبقہ کی زبان کو بند کرنا اور ان کی جدوجہد کو محدود کرنا ہے، جن کا بنیادی مشن اسلام کی اشاعت وحفاظت ہے اور یہ سب کچھ صرف حکومتِ ہند کا منصوبہ نہیں ہے؛ بلکہ یہ ایک عالمی منصوبہ ہے جس کے تانے بانے امریکہ اور اسرائیل میں بنے گئے ہیں۔ یہ حالات علماء ومشائخ، دینی مدارس وجامعات اور دینی جماعتوں سے وابستہ حضرات کے لئے لمحۂ فکریہ ہیں کہ کیا ان کا مقصد زندگی صرف روٹی کے ٹکڑے حاصل کرنا ہے، جس طور پر بھی حاصل ہوجائیں، یا وہ اس سے اعلیٰ وارفع مقصد کے لئے کام کررہے ہیں، وہ انبیاء کے وارث ہیں، جو اجرت کے لئے نہیں، اجر کے لئے کام کرتے تھے، وہ اس کائنات میں خدائی مشن کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا ذریعہ ہیں یا مادیت کے پرستار، یہ وقت ہے کہ علماء سر جوڑ کر بیٹھیں، اس مسئلہ پر غور کریں، اپنے سلف کے راستہ پر خود کو ثابت قدم رکھیں، دین کے فروغ کو اپنی متاع حیات بنانے کا عہد کریں اور اس بات کا عزم مصمم کریں کہ نہ فولاد وآہن کی طاقت اظہار حق کے معاملہ میں انہیں خوف زدہ کرسکے گی اور نہ سیم وزر کی لالچ انہیں اپنا اسیر بنا سکے گی کہ بہ حیثیت مسلمان ہمارا جینا اور مرنا سب اللہ کے لئے ہے: "اِنَّ صَلَاتِی وَنُسُکِی وَمَحیایَ وَمَمَاتِی لِلّٰہِ رَبِّ العٰلَمِینَ"

☆☆☆

❑ احساس ذمہ داری

دنیا میں بڑھتی افراتفری اور امتِ مسلمہ کی ذمہ داریاں

مولانا محمد اسرار الحق قاسمی

عہدِ حاضر میں جس تیزی کے ساتھ عالمی سطح پر افراتفری پھیل رہی ہے، وہ پوری دنیائے انسانیت کے لیے تشویشناک امر ہے۔ دنیا کے اکثر ممالک میں تباہی اور افراتفری کے مناظر کا پہلی نظر میں ہی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے لیکن بعض ممالک ایسے ہیں جن میں بظاہر افراتفری وتباہی دکھائی نہیں دیتی، مگر جب گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جاتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اندر اندر تباہی کے راستے پر چل رہے ہیں۔ مثال کے طور پر فی زمانہ دنیائے انسانیت کو خطرناک لڑائیوں کا سامنا ہے۔ گذشتہ صدی میں دو عالمی جنگیں ہوچکی ہیں جن میں بڑے پیمانے پر جانی ومالی نقصان ہوا۔ ایک اندازے کے مطابق پہلی جنگِ عظیم (1917) میں تقریباً 90 لاکھ لوگ ہلاک ہوئے۔ 2 رکروڑ 20 لاکھ شدید زخمی ہوئے اور 2 رکروڑ 50 لاکھ لوگ معذور ہوگئے۔ یہ مجموعی اعداد وشمار نہیں ہیں بلکہ میدانِ جنگ کے ہیں جو افراد اپنے شہروں، قصبوں اور گاؤں میں جنگ کے اثرات سے متاثر ہوکر جاں بحق ہوئے، ان کی تعداد اور بھی زیادہ بتائی جاتی ہے۔ اس جنگ کے نتیجے میں لگ بھگ 50 لاکھ عورتیں بیوہ ہوگئی تھیں، لاکھوں بچے یتیم اور لاکھوں عورتیں و بچے غائب ہوگئے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے نتائج اس سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوئے۔ اس میں ہلاک ہونے والے فوجیوں اور عام لوگوں کی تعداد ایک اندازے کے مطابق 54.8 ملین تھی یعنی پہلی جنگِ عظیم کے مقابلے میں چھ گنا زیادہ جس کے اعتبار سے اس جنگ کے نتیجے میں مرنے والوں کی تعداد کسی بھی صورت میں 5 رکروڑ سے کم نہیں بیٹھتی۔ اس جنگ میں معذور ہونے والوں کی تعداد دو کروڑ تھی۔ واشنگٹن پوسٹ کی تحقیقی رپورٹ کے مطابق 20 ویں صدی کی جنگوں میں 10 رکروڑ افراد ہلاک ہوئے۔

21 رویں صدی کی شروعات بھی خوفناک واقعات اور جنگوں سے ہوئی۔ 11 رستمبر 2001ء کو امریکہ کی دو فلک بوس عمارتیں مغویہ ہوائی جہازوں کے حملوں میں زمیں بوس ہوگئیں، جس کے نتیجے میں وہ دونوں بلند وبالا ٹاور خاکستر ہوگئے اور اس میں موجود ہزاروں افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس نے پوری دنیا کو ہلاک کرکے رکھ دیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے تیزی کے ساتھ جنگوں اور حملوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ 2001ء میں ہی افغانستان پر چڑھائی کردی گئی اور اس وقت کی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔ اس جنگ میں عوام بھی متاثر ہوئے اور بڑی تعداد میں افغانی باشندے موت کی نیند سوگئے۔ تصادم، مارکاٹ اور قتل وغارت گری کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ 15 رسال کے عرصے میں یقیناً افغانستان میں موت کی بہت بڑی جانی ومالی تباہی ہوئی۔ 2003ء میں

عراق پر جنگ مسلط کردی گئی۔ چاروں طرف سے ناکہ بندی کرکے اس ملک کی صدام حکومت کو زیر وزبر کردیا گیا، دورانِ جنگ مرنے والوں کی تعداد اچھی خاصی تھی ہی لیکن جنگ کے بعد ہلاک ہونے والوں کی تعداد کتنے ہی گنا زیادہ ہے۔ یہ پورا ملک سخت تباہی سے دوچار ہوا ہے، بعض اندازوں کے مطابق 2003ء کے بعد سے اب تک عراق میں 20/لاکھ سے زیادہ لوگ مارے جاچکے ہیں۔ افغانستان اور عراق کی طرح لیبیا میں خوفناک حالات بنے۔ وہاں انقلاب کے نام پر معمر قذافی کے اقتدار کا خاتمہ کردیا گیا اور اس کے نتیجے میں بے شمار لوگوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ وہاں عدمِ استحکام کی صورتِ حال ہنوز جاری ہے۔ تیونس میں بھی اسی طرح کے حالات سامنے آئے۔ مصر میں افراتفری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ پہلے وہاں حسنی مبارک کے اقتدار کا خاتمہ ہوا۔ نئے صدر محمد مرسی عوامی رائے سے منتخب ہوئے لیکن مصر کی فوج، حسنی مبارک کے گروپ اور مغربی ممالک کو محمد مرسی ایک آنکھ نہیں بھائے۔ چنانچہ فوج نے بغاوت کردی۔ ایک خوفناک لڑائی ہوئی، بڑی مقدار میں انسانی خون بہا۔ محمد مرسی کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس کے بعد محمد فتح السیسی کے ہاتھوں میں اقتدار دے دیا گیا، جو بڑا متشدد اور سخت واقع ہوا۔ مصر میں سخت اور نازک حالات ابھی بھی برقرار ہیں اور آئے دن مصری عوام باہمی تصادم اور جھڑپوں کے سبب ہلاک ہورہے ہیں۔ اگر بات ملک شام کی کی جائے تو یہاں صورت حال اور زیادہ ابتر ہے۔ پانچ سال سے زائد عرصہ بیت چکا ہے مگر وہاں حکومت اور عوام کے مابین جاری تصادم میں کوئی کمی واقع نہیں ہورہی ہے۔ اب تک کئی لاکھ لوگ شام میں لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔ یہ تو چند ممالک کے حالات ہیں۔ اگر اسی طرح سے اور بھی ملکوں میں پھیلی بدامنی اور افراتفری کا جائزہ لیا جائے تو وہاں بھی باہمی لڑائیوں میں روز بروز انسانی جانیں تباہ ہوچکی ہیں۔ سیاسی حالات جس تیزی کے ساتھ بگڑ رہے ہیں۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے بعض مبصرین نے تو تیسری عالمی جنگ کے خدشات ظاہر کردیے ہیں۔ اگر خدانخواستہ اب تیسری عالمی جنگ ہوئی تو انسانوں کا کتنا بڑا نقصان ہوگا، سابقہ عالمی جنگوں اور موجودہ حالات کو پیش نظر رکھ کر اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

دنیا کے حالات اس طور پر بھی بہت زیادہ خراب ہوچکے ہیں کہ دنیا میں مادیت اور روحانیت کے درمیان توازن بگڑ گیا ہے۔ عوام الناس کا سارا زور مادیت پر ہوگیا ہے۔ آج لوگ مالدار بننے کی خواہش رکھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے پاس جائیداد ہو، بینک بیلنس ہو، گاڑیاں ہوں، بڑے اور آراستہ مکانات ہوں اور عیش ومستی کرنے کے لیے ڈھیر سارے وسائل وذرائع ہوں۔ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے وہ شب وروز ایک کررہے ہیں۔ انھیں نہ دن میں چین ہے اور نہ رات میں سکون۔ رات دن ایک کرنے کے باوجود بھی بہت سے اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوپارہے ہیں۔ ان کی معیشت مضبوط نہیں ہوپارہی ہے۔ ان کے پاس بینک بیلنس نہیں بن پارہا ہے۔ یہاں تک کہ ان کی اپنی احتیاجات بھی پوری نہیں ہوپارہی ہیں۔ مکان بنانے کی ضرورت، دووقت کے کھانے کی ضرورت اور بچوں کی شادیوں کی ضرورت ان کی کمر کو توڑے ڈال رہی ہے۔ ایسے لوگ نہایت پریشان ہیں، بے چینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ کتنے لوگ اپنی ناکامی کے باعث ڈپریشن کے شکار ہوچکے ہیں۔ کتنے لوگ اپنی احتیاجات کو دیکھتے ہوئے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں اور غلط راستے اختیار کررہے ہیں۔ ایسی صورت میں وہ اپنے لیے بھی خطرناک ثابت ہوتے

ہیں اور دوسروں کے لیے بھی۔

مال و دولت کی بڑھتی خواہش کے باعث بہت سے لوگ ایمانداری اور دیانت داری کا سبق بھول گئے ہیں اور وہ زیادہ سے زیادہ کمانے کے لیے خطرناک ہتھکنڈے استعمال کررہے ہیں ، کتنے لوگ ایسے ہیں جو نشہ آور اشیا کی خرید وفروخت کرکے اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں مگر دوسروں کی زندگیوں سے کھلواڑ کررہے ہیں ۔بعض لوگ جرائم ، بدعنوانی اور رشوت خوری کے ذریعہ دوسروں کے حقوق غصب کررہے ہیں۔کرپشن اور بدعنوانی کی جہاں تک بات ہے تو آج اس میں کوئی ایک طبقہ ملوث نہیں ہے بلکہ چھوٹے بڑے سبھی طبقات ملوث نظر آتے ہیں۔اشیائے خوردنی میں ملاوٹ اور وہ بھی خطرناک کیمکل کی ملاوٹ کے واقعات سامنے آرہے ہیں۔سبزیوں کی ملاوٹ نے بھی انسانی زندگی کو دوبھر کردیا ہے۔کسان زیادہ کمانے کے لیے یا پھر اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ہائی بریڈ سبزیاں تیار کررہے ہیں جو انسانوں کے لیے بڑی خطرناک ثابت ہورہی ہیں۔گویا کہ مادی سطح پر انسان بہت حد تک پچھڑ چکا ہے۔

روحانی لحاظ سے جب آج کے انسان کا جائزہ لیا جاتا ہے تو وہ اس میدان میں بڑا لٹا پٹا دکھائی دیتا ہے۔لوگوں کے درمیان سے دورِ حاضر میں روحانیت ختم سی ہوگئی ہے۔بہت سے لوگ تو روحانیت کے معانی ومفاہیم تک سے واقف نہیں۔حالاں کہ روحانیت کو انسانی زندگی میں بہت بڑا دخل ہے۔روح کے بغیر انسان کی زندگی کا تصور محال ہے، روح کے اطمینان کے بنا انسان کی زندگی میں سکون کا گذر نہیں ہوتا۔روحانیت انسان کو معتدل بناتی ہے ، گناہوں اور بدعنوانیوں سے نجات دلاتی ہے اور انسان کو اس کا فرضِ منصبی یاد دلاتی ہے۔اسی لیے مفکرین نے کہا ہے کہ دنیا میں روحانیت اور مادیت کے درمیان توازن ضروری ہے۔ان میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کرنے میں بڑا نقصان ہے۔روحانیت سے انسانی اقدار کے چشمے پھوٹتے ہیں۔انسان با اخلاق و با کردار بنتا ہے اور اپنے لیے بھی بہتر ثابت ہوتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی بہتر ثابت ہوتا ہے۔اس کے علاوہ اور بھی بہت سے گوشے ایسے ہیں جن کے اعتبار سے دورِ حاضر کے انسان کی زندگی کا جائزہ لینے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ حقیقت یہی ہے کہ موجودہ دور میں انسان خسارے میں ہے اور ہر طرف سے تباہی و بربادی کے درمیان گھرتا چلا جارہا ہے۔جیسا کہ قرآن میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاس۔

دنیائے انسانیت کو تباہی وافراتفری سے بچانے کے لیے دنیوی نظام ناکام ثابت ہوچکے ہیں۔بڑے بڑے مفکرین نے انسانوں کو مختلف نظریات دیے لیکن وہ بھی ناکام ہوچکے ہیں۔دراصل اس وقت انسان کو خدائی نظام وقانون کی ضرورت ہے، خدائی احکامات ونواہی کی ضرورت ہے۔اس اعتبار سے دیکھا جائے تو روئے زمین پر فی الوقت اسلام ایک ایسا دین نظر آتا ہے جو انسانوں کی صحیح رہنمائی کرسکتا ہے اور عوام الناس کو تباہی و بربادی سے بچاسکتا ہے کیونکہ وہ کسی بھی طرح کی ترمیم وتبدیلی سے محفوظ ہے جب کہ دوسرے مذاہب تبدیلی وتحریف کے شکار ہوچکے ہیں جس کے باعث وہ انسانوں کی مکمل رہنمائی کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے۔اللہ کی جانب سے نازل ہونے والی کتابوں میں قرآن محفوظ بھی ہے اور انسانوں کی رہبری کے لیے مکمل وجامع بھی ہے۔قرآن کی حفاظت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنا الذکر وانالہ لحافظون ۔یعنی باری تعالی نے ارشاد فرمایا کہ ''ہم نے ہی

قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔'' ظاہر ہے کہ جس کی حفاظت کی ذمہ داری باری تعالیٰ خود لے رہا ہے، اس کو کوئی کیسے بدل سکتا ہے یا مٹا سکتا ہے۔ دین اسلام کی جامعیت کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا**''۔

معلوم ہوا کہ دین اسلام انسانوں کی فلاحیابی وکامیابی کے لیے ناگزیر ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اورآپ کی احادیث کا بھی بہت بڑا ذخیرہ مسلمانوں کے پاس محفوظ ہے۔ گویا کہ اس دنیا میں مسلمان ایک ایسی قوم ہے جو پوری بنی نوعِ انساں کے لیے مفید ثابت ہوسکتی ہے۔ قرآن کی اس آیت ''**کنتم خیر امت اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر** میں صاف کہا گیا ہے کہ امت مسلمہ بہترین امت ہے۔ اسے لوگوں کے لیے اٹھایا گیا ہے۔ اس کا کام اچھائی کا حکم کرنا اور برائی سے روکنا ہے۔ یعنی دنیا میں دوسری قوموں کی رہبری کا فریضہ بھی انجام دینا ہے۔

اب غور کرنے کا مقام یہ ہے کہ کیا مسلمان اپنے اس فریضہ کو انجام دے رہے ہیں؟ اور وہ دوسروں کے لیے کوئی کردار ادا کر پا رہے ہیں۔ فی زمانہ مسلمانوں کی صورت حال یہ ہے کہ وہ بے اثر ہوگئے ہیں اور اپنے فرائضِ منصبی سے غافل ہوکر زندگی گزار رہے ہیں اور فی الوقت وہ اس پوزیشن میں بھی نظر نہیں آتے کہ دوسروں کی رہبری کا کام کریں۔ کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت خود خدائی نظام سے دور ہے اور اسلام کے مطابق کما حقہ زندگی نہیں گزارتی، بہت سے مسلمان اسلامی تعلیمات سے بھی واقف نہیں۔ ایسے میں وہ کیسے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بہتر ثابت ہوسکتے ہیں۔ مسلمانوں کی رہبری چونکہ دنیا کو حاصل نہیں اور لوگ ان کے کردار سے محروم ہیں، اس لیے دن بہ دن بدترین حالات سے دوچار ہوتے جارہے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب مسلمانوں کی رہبری دنیا کو حاصل تھی تو دنیا کے لوگوں نے بہت کچھ پایا مگر جب دنیا پر مسلمانوں کا اثر نہ رہا تو ساری دنیا تباہی کے راستے پر چل پڑی۔ ایسے میں مسلمانوں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو دین کے مطابق ڈھالیں۔ اسلامی تعلیمات سے واقف ہوں، قرآن پر عمل کریں، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کو اپنے لیے نمونہ بنائیں اور تعمیری کردار پیش کریں۔ یہ یاد رکھیں کہ اگر انھوں نے اپنے آپ کو اسلام کا پابند نہیں بنایا اور دنیا کی فکر نہ کی تو اس سے ان کا اپنا بھی نقصان ہوگا اور دنیائے انسانیت کو بھی خسارے سے دوچار ہونا پڑے گا۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ جب دنیا پر مسلمانوں کے اثرات تھے تو دنیا میں امن وامان کی ہوائیں چل رہی تھیں اور دنیا کے لوگ زندگی کے مختلف شعبوں میں ترقی کررہے تھے، مگر جب دنیا میں مسلمانوں کے اثرات نہ رہے، تو دنیا کو بڑے خسارے سے دوچار ہونا پڑا۔ بہت سے شعبوں میں دنیا کے لوگ پچھڑ گئے جس کے باعث انسانی زندگی غیر متوازن ہوکر رہ گئی اور اس کے نتائج آج ہمارے سامنے ہیں۔ یہ حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ دنیا میں اسلام کی روشنی کو پھیلایا جائے اور انسانی زندگی کے فائدے کے لیے مخلصانہ کوششیں کی جائیں۔ مسلمان اگر اپنے دینی سرمایہ کے ذریعہ انسانیت کی خدمت کرنا چاہیں تو وہ یقیناً بڑے پیمانہ پر پوری بنی نوع انساں کی خدمت انجام دے سکیں گے۔ کاش! مسلمان اپنی اس ذمہ داری کو محسوس کریں اور تمام دنیا کے لیے بہتر ثابت ہوں۔

☆☆☆

❑ ماحولیات (دوسری اور آخری قسط)

ماحولیات کا تحفظ اسلام کی نظر میں

مولانا محمد قمر الزماں ندوی
جنرل سکریٹری: مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی

مذبوحہ جانور کے ناقابل استعمال اجزاء کے سلسلہ میں شریعت کے احکام: مذبوحہ جانور کے وہ اجزاء جو نا قابل استعمال ہیں اور جو بہت تیزی سے فضا کو آلودہ کرتے ہیں، ایسے نا قابل استعمال اشیاء کو، قربانی کرنے والے حضرات آبادی سے دور کسی محفوظ مقام میں مدفون کرائیں، یہ ان کی ذمہ داری ہے تاکہ فضا میں تعفن پیدا نہ ہو اور برادران وطن کو بھی ہماری وجہ سے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ حکمِ شریعت یہی ہے کہ قربانی کی فضلات کو دفن کر دیا جائے، اگر حکم شریعت کو انسان ملحوظ رکھے تو ماحول کو اس طرح کی آلودگی سے بچانا بالکل ہی آسان ہے۔ لیکن افسوس کہ قربانی کے دنوں میں جانور ذبح کیے جاتے ہیں اور بہت سے ہمارے مسلمان بھائی بے شعوری کی وجہ سے قربانی کے فضلات سڑکوں اور نالیوں پر ڈال دیتے ہیں جس کی بنا پر بہت سے برادران وطن کو شکوہ کا موقع مل جاتا ہے۔ ہمیں یاد رکھنا ہوگا کہ شریعت محمدی نے تو ایسے ایندھن کے استعمال سے روکا ہے جس کا دھواں پڑوسی کے گھر میں جاتا ہو، فضائی اور ماحولیاتی آلودگی سے بچنے کے لئے یہ حکم ایک اصول اور کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے جس سے آج ہم مذبوحہ جانور کے نا قابل استعمال اجزاء کے سلسلے میں قانون اور ضابطہ بنا سکتے ہیں، اصل چیز یہ ہے کہ انسان کے اندر ذمہ داری اور جواب دہی کا احساس پیدا ہو جائے۔

دوسری طرف حکومتِ وقت کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ مذبح کے لیے جو لائسنس فراہم کرے اس میں بہت ہی باریک بینی سے کام لے اور اس کے لئے ایسے اصول اور ضوابط بنائے کہ فضائی اور ماحولیاتی آلودگی کا خطرہ اس جانب سے بالکل راہ نہ پا سکے۔ آبادی سے بالکل ہی دور ''مذبح'' کے لیے لائسنس فراہم کئے جائیں اور ''مذبح'' والوں سے اس سلسلے میں کسی طرح کی رعایت نہ برتی جائے چونکہ ماحول کو صاف ستھرا اور کثافت سے دور رکھنا یہ حکومت کی اہم ذمہ داریوں میں سے ایک ہے۔

پلاسٹک کی پیکنگ اور تھیلیوں کا استعمال: پلاسٹک کی خوبی کہیے یا کمی کہ یہ زمین میں تحلیل نہیں ہوتی اور جلانے پر اس سے بہت ہی کثیف دھواں پیدا ہوتا ہے، جو عام طور پر صحت کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے، اس سے بڑے پیمانہ پر فضائی آلودگی پیدا ہوتی ہے۔ پلاسٹک سے نکلنے والا دھواں پوری فضا کو متاثر کرتا ہے اور اس سے کان، آنکھ اور جسم کے دیگر اعضا بھی متاثر ہوتے ہیں، ہمارے ماحول کو نقصان پہنچانے والی چیزوں میں ماہرین اس کو بہت خطرناک قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ آسانی و خوش نمائی کی غرض سے اور خاص کر سستا ہونے کی وجہ سے اس کا استعمال اس کثرت سے ہو رہا ہے کہ اس کی خطرناکی کی طرف سے ذہن ہٹ جاتا ہے۔ حکومت کی تساہلی اور عوام الناس کا عدمِ احساس ذمہ داری کیا حالات لائیں گے الامان والحفیظ، مرض کا اقرار اور احساس بھی ہے لیکن علاج اور دوا کی فکر نہیں۔

میری نظر میں ازروئے شرع ایسی مضر اشیاء کا استعمال بطور پیکنگ (یا سامان کو ڈھونے کے طور پر) جائز نہیں ہونا چاہیے حکومت کو چاہیے کہ اس کا متبادل پیش کرے (مثلاً کپڑے کے باریک تھیلے، جوٹ کے بنے بورے، بوریاں اور تھیلے وغیرہ) اور پوری سختی کے ساتھ پلاسٹک کے استعمال پر پابندی لگائے، اس کے لئے ٹھوس مضبوط اور پائدار قانون بنائے اور اس پر عمل کرنے پر پبلک کو مجبور کرے اور نشر واشاعت کے ذرائع سے اس کی خطرناکی کی تشہیر کرائے، اور عوام الناس کو بھی چاہیے کہ ملک وملت قوم وسماج اور خود اپنی صحت کی حفاظت کے لیے ان قوانین پر عمل کریں۔ سماجی، فلاحی اداروں کو بھی اس میں اہم رول ادا کرنا چاہیے، حکومت کی ایک خامی اور نقص یہ ہے کہ قوانین وضع تو کرتی ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرا سکتی ہے، باوجود اس کے کہ اس کے پاس قوتِ تنفیذ بھی ہے، عملہ، کارکنان پولس انتظامیہ اور فوج سب کے سب دستیاب ہیں۔

کیا سگریٹ، بیڑی، اسموکنگ زون میں استعمال کرنا مستحسن ہوگا؟: تمباکو سے بنی ہوئی اشیاء خواہ سگریٹ ہو یا بیڑی، گٹکھا یا حقہ، اس سے جو دھواں نکلتا ہے وہ انتہائی کثیف اور مسموم ہوتا ہے، اس کا نقصان صرف پینے والے ہی کو نہیں ہوتا، بلکہ اس کے متعلقین اور ہم نشینوں کو بھی ہوتا ہے، اور بحیثیت مجموعی اس سے ماحول پراگندہ ہوتا ہے اور یہ صحت انسانی کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے، اس لئے اس سے بچنا واجب ہے اور اس کا استعمال مکروہ ہے، "ویمنع من بیع الدخان وشربه" (ردالمختار ۵/۲۹۵)

آپ ﷺ نے نشہ آور اور صحت کے لئے مضرت رساں دونوں طرح کی چیزوں سے منع فرمایا ہے، اور جدید طبی تحقیق نے یہ بالکل ثابت کر دیا ہے کہ کینسر اور دیگر موذی امراض اس سے پیدا ہوتے ہیں۔ "نهى رسول الله عن كل مسكر ومضر" (مسند احمد/ابوداود)۔

جس چیز میں ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات پائی جائے، یعنی وہ چیز جو استعمال کے بعد نشہ پیدا کرے، یا اعضاء پر سستی، بے حسی اور غفلت اور فتور طاری کرے وہ ممنوع ہے، اور سگریٹ تمباکو بھی فتور دماغ اور نشور اعصاب کا موجب بن جاتا ہے، اس لئے اس کے مضر ہونے میں کوئی شک نہیں ہونا چاہیے، یہ مختصر سی حدیث جو آنحضرت ﷺ کے جوامع الکلم میں سے ہے تمباکو نوشی کی کراہت وممانعت کا فیصلہ کرنے کے لئے کافی ہے۔

جدید تحقیقات نے تو تمباکو اور سگریٹ نوشی کے مضرات کو بیان کر ہی دیا ہے لیکن اگر صرف دین ومذہب کی عینک سے اس کے جواز یا عدم جواز کا جواب تلاش کریں تو اس کے لئے قرآن وحدیث میں بے شمار دلائل موجود ہیں۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ ویحل لهم الطيبات ويحرم عليهم الخبائث (اعراف:۱۵۷) اور یہ پیغمبر ﷺ پاک چیزوں کو ان کے لئے حلال کرتے اور ناپاک چیزوں کو ان پر حرام ٹھہراتے ہیں۔ سورہ مائدہ میں فرمایا گیا: وكلوا مما رزقكم الله حلالا طيبا (مائدہ:۸۸) اور کھاؤ اللہ کے دیے ہوئے میں سے جو چیز حلال پاکیزہ ہو۔ اور اس آیت سے ما قبل میں فرمایا گیا: اليوم احل لكم الطيبت آج تمہارے لئے حلال ہوئیں سب صاف ستھری چیزیں۔

مولانا مفتی شفیع صاحبؒ اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''لغت میں طیبات صاف ستھری اور مرغوب چیزوں کو کہا جاتا ہے اور خبائث اس کے بالمقابل گندی اور قابل نفرت چیزوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس لیے آیت کے اس جملہ نے یہ بتلا دیا کہ جتنی چیزیں صاف ستھری مفید اور پاکیزہ ہیں وہ انسان کے لیے حلال کی گئیں اور جو گندی قابل نفرت اور مضر ہیں وہ حرام کی گئی ہیں''۔ (معارف القرآن جلد۳/صفحہ۴۳)۔

تمباکو نوشی ایک مسرفانہ عمل بھی ہے، کیوں کہ اس کے پینے سے کوئی فائدہ نہیں ہے بلکہ الٹا نقصان ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: لا تبذروا إن المبذرين كانوا إخوان الشيطين وكان الشيطان لربه

کفورا" (بنی اسرائیل:۲۶-۲۷)۔اورفضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ کہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھائی ہیں،اور شیطان (اپنے پروردگار کی نعمتوں) کی ناشکری کرنے والا ہے۔

اورسورہ اعراف میں اللہ تعالیٰ نے ارشادفرمایا:کلوا واشربوا ولا تسرفوا انہ لا یحب المسرفین" (اعراف:۳۱) کھاؤ اور پیو اور بے جا نہ اڑاؤ کہ بے شک اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں (بے جا اڑانے والوں) کو پسند نہیں کرتا۔

تمبا کو اور سگریٹ نوشی کا عادی انسان ہمیشہ ایک غیر قانونی اور غیر اخلاقی راستہ اختیار کرتا ہے اور سوال جیسی ذلت سے بھی دو چار ہوتا ہے حالانکہ آپ ﷺ نے حدیث شریف میں فرمایا: "السوال ذل" مانگنا بری چیز ہے۔

مذہب اسلام نے نظافت اور صفائی وستھرائی کا نہایت اعلیٰ معیار قائم کیا ہے یہاں تک کہ حضور ﷺ نے ارشادفرمایا:"الطھور شطر الایمان" (مسلم کتاب الطہارۃ) پاکی نصف ایمان ہے۔

اسلام نے جس طرح پاکیزگی اور نظافت کا تصور دیا ہے اس کی روشنی میں کوئی ذوق سلیم رکھنے والا بھی تمبا کو کو طیبات وصاف ستھری چیزوں میں شمار نہیں کرے گا، کیوں کہ اس سے بدبو آتی ہے اور بدبو بہرحال ناپسندیدہ ہے۔ اور تمبا کو نوشی اور سگریٹ نوشی سے طرح طرح کی گندگی پھیلتی ہے۔

تمبا کو نوشی سے ہر طرح کی موذی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ سگریٹ اور تمبا کو بنانے والی کمپنیاں پیکٹ پر لکھتی ہیں کہ اس کے استعمال سے کینسر اور ہر طرح کی موذی بیماریاں جنم لیتی ہیں، امریکہ اور جرمنی کے اداروں نے اس سلسلے میں پوری تحقیقات پیش کردی ہیں، اس کے باوجود ان مضرت رساں اور نقصان دہ اشیاء کا استعمال کرنا گویا اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنا ہے، اور یہ ایک طرح کی خودکشی ہے، اور قرآن کی صراحت ہے۔" ولا تلقوا بایدیکم إلی التھلکۃ" اور اپنے آپ کو ہلاکت وتباہی میں مت ڈالو۔

اس لئے ان تفصیلات کی روشنی میں سگریٹ نوشی اور تمبا کو نوشی کو ناجائز قرار دینا ہی قرین قیاس ہے اور قرآن وسنت سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔

کیا اسموکنگ زون کا استعمال ایسے لوگوں کے لئے ضروری ہوگا؟

لیکن افسوس کہ تمبا کو اور سگریٹ نوشی کے ان تمام نقصانات اور مضرات کے باوجود اہل مغرب اس کے استعمال میں پیش پیش ہیں، اور اس کے استعمال کی نت نئی شکلیں وجود میں آرہی ہیں، اور یورپ ومغرب کی نقالی میں برصغیر کے لوگ بھی جدید اسموکنگ میں ان سے سبقت لے جارہے ہیں یا لے جانے کی فکر میں ہیں۔

عالمی ادارۂ صحت (یونیسیف) کو اس سلسلے میں قانون اور ضابطہ بنانا چاہیے تھا اور تمام ملکوں کو اس سلسلے میں سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے تھا، لیکن افسوس کہ آج تک ایسا کوئی قانون نہیں بن سکا کہ مکمل طور پر اس پر پابندی لگ سکے، مسلم ممالک کو چاہیے تھا کہ وہ اس جانب پیش قدمی کرتے اور کم از کم اسلامی ممالک تو اس خطرناک وبا اور مہلک اور خطرناک اشیاء کے استعمال سے پاک رہتے لیکن وہ بھی مغرب ہی کی نقالی میں مشغول ہیں اور اس طرح کی اشیاء وہاں کثرت سے استعمال کی جاتی ہیں اور مغربی ممالک بڑی فیاضی کے ساتھ (عربی کلمات میں تعارف کے ساتھ عربی پیکنگ کے ساتھ) خلیجی ممالک میں بھیج رہے ہیں۔

خیر جو لوگ اس غلط اور مضر چیز کے عادی ہوگئے ہیں اور حکومت نے ان اشیاء کے استعمال کرنے والوں کے لیے کوئی ضابطہ اور قانون بنایا ہے تاکہ دوسرے لوگوں کو تکلیف اور زحمت نہ ہونے پائے اور ماحول کو نقصان نہ پہنچے تو ایسے قانون اور ضابطہ پر عمل کرنا ایسے لوگوں کے ضروری ہوگا، مثلاً ایرپورٹ اور دیگر عوامی مقامات پر ایسے لوگوں کے لئے اسموکنگ زون بنایا گیا ہے لہذا اسموکنگ کے عادی لوگوں کے لیے اس کا استعمال کرنا ضروری ہوگا، اس کو چھوڑ کر پبلک پیلیس

میں اس کا استعمال قانونا جرم ہوگا، اگر حکومت اس کے لئے کوئی تعزیر اور جرمانہ طے کرتی ہے تو وہ اس میں حق بجانب ہے۔

مفتی عبدالرحیم صاحب لاج پوریؒ سے کسی نے فتوی پوچھا کہ بعض لوگوں کی عادت ہے کہ لوگوں کے سامنے ناک میں انگلی ڈال کر چیپڑے نکالتے ہیں کیا ایسا کرنا برا نہیں ہے؟ مفتی صاحب رحمۃ اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا:

''لوگوں کے سامنے ناک میں انگلی ڈال کر چیپڑے نکالنا مکروہ اور بری عادت ہے اس سے احتراز کرنا چاہیے'' ویکرہ ازالة درنه بحضرة الناس'' (غنیۃ الطالبین ص۱۳، ج۱، فتاویٰ رحیمیہ جلد دہم، ص۲۳۵)۔

اس فتویٰ کی روشنی میں مذکورہ سوال کا جواب آسان ہوجاتا ہے کہ جس طرح لوگوں کے سامنے رینٹ وغیرہ نکالنا اور بہانا درست نہیں کیوں اس سے طبیعت کو تکدر ہوتا ہے اور انسان کو اذیت پہنچتی ہے، اسی طرح سگریٹ کے دھویں سے انسان کو سخت تکلیف پہنچتی ہے، اس لئے اس دھویں کا لوگوں کے سامنے نکالنا درست نہیں ہوگا، بلکہ اس کے لئے محفوظ اور مخصوص جو جگہ بنائی گئی ہے اس کا استعمال شرعا اور قانونا لازم ہوگا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

عوامی مقامات پر گندگی پھیلانا گناہ ہے: اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کھلے عام گندگی نہ پھیلائی جائے تاکہ فضا مکدر اور مسموم نہ ہو چنانچہ آپ ﷺ نے بلغم اور تھوک وغیرہ کو دفن کرنے کا حکم دیا، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: مسجد کے اندر بلغم جھاڑنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اسے دفن کردینا ہے۔

اس حدیث پاک میں مسجد کی تخصیص مزید شناعت وقباحت بیان کرنے کے لئے ہے ورنہ ہر جگہ کا یہی حکم ہے کہ قابل تنفر اشیاء اور گھن کرنے والی چیزوں کو ڈھک دیا جائے۔

اسلام کی پاکیزہ تعلیمات میں سے یہ بھی ہے کہ راستہ سے تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا صدقہ ہے، اسلام اپنے ماننے والوں کو اس کا خاص طور پر مکلّف بناتا ہے کہ سایہ دار جگہ پر قضائے حاجت نہ کی جائے، راستے اور گھاٹ کے کنارے یا وہ جگہ جہاں لوگ بیٹھا کرتے ہوں، ایسی جگہ پر ہرگز گندگی نہ پھیلائی جائے اور نہ ہی اس جگہ پر قضائے حاجت کی جائے۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ فضا کو مسموم نہ ہونے دیا جائے، اسی وجہ سے اسلام نے مُردوں کی تدفین کا حکم دیا ہے، اس کا جہاں ایک مقصد انسانوں کی تکریم ہے وہیں دوسرا اہم مقصد یہ بھی ہے کہ مردہ جسموں سے پیدا ہونے والی نجاست اور بدبو سے فضا مسموم نہ ہو۔ چنانچہ حدیث میں مردہ کے دفن کرنے کو واجب قرار دیا گیا ہے۔

لہذا ان تفصیلات کی روشنی میں مندرجہ ذیل ہدایات سامنے آتی ہیں جن پر عمل کرنا از روئے شرع اور قانون ملکی کے مطابق بھی واجب اور ضروری ہوگا۔

(۱) صاحب حیثیت لوگوں پر ضروری ہوگا کہ وہ اپنے گھر کے اندر بیت الخلا کا انتظام کریں اور اس سلسلے میں جدید تکنیک کا استعمال کریں یعنی ایسے بیت الخلا تعمیر کرائیں جو فضائی آلودگی کا سبب نہ بنیں۔

(۲) جن علاقوں میں حکومت کی جانب سے پکی تعمیرات اور بیت الخلا بنانے کی اجازت نہیں ہے وہاں حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اجتماعی بیت الخلا عصر حاضر کے تقاضے کے مطابق جدید سہولیات کے ساتھ تعمیر کرائیں اور اس کی صفائی ستھرائی کا مناسب انتظام حکومت اپنی نگرانی میں کرائے۔

(۳) دیہات کے باشندوں کے لے ضروری ہے کہ وہ قضائے حاجت کے لیے آبادی سے دور جائیں، آبادی کے کنارے، درخت اور تالاب ونہر کے کنارے قضائے حاجت نہ کریں۔ اور جو اصحاب ثروت ہیں وہ اپنے لیے بیت الخلا کا نظم خود کریں۔ اور غریبی کی سطح پر زندگی گزارنے والوں کے لیے حکومت انتظام کرے یا اس

سلسلے میں کچھ سہولیات فراہم کرے تاکہ غریب لوگ بھی بیت الخلا تعمیر کراسکیں۔ اس سلسلے میں ہمہ جہت ترقی وتعمیر اور منصوبہ بندی حکومت کی اولین ذمہ داری ہے، بہت سے ملکوں میں اس کے لئے مناسب اسکیمیں حکومت اپنی رعایا کو دے رہی ہے، ان ملکوں کے نظام سے ہم فائدہ اٹھائیں۔

(۴) پبلک پیلیس (عام مقامات) پر جو استنجا خانے وغیرہ بنائے جاتے ہیں، عوام الناس کی ذمہ داری ہے کہ ان کا ہی استعمال کریں اور ادھر ادھر استنجا وغیرہ کرنے سے احتراز کریں، حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اس جگہ کی صفائی ستھرائی کے لیے عملہ متعین رکھے عام مقامات پر بے اصولی برتنے والوں کے خلاف حکومت جرمانہ عائد کرے تاکہ پبلک پر اس کا اثر پڑے اور آئندہ ایسی حرکت کرنے سے باز رہے۔

(۵) گھر کی گندگی اور ٹینک وغیرہ کے گندے پانی کو کھلے عام نالیوں اور سڑکوں اور گلیوں میں ڈالنا از روئے شرع جائز نہیں ہوگا۔ حکومت نے اس کے لئے جو کوڑے دان رکھوائے ہیں ان کا استعمال ہر حال میں لازمی ہوگا۔ ٹینک وغیرہ کی صفائی کے لے رات کا وقت متعین کریں اور بدبو کو دور کرنے کے لئے جن پاؤڈروں کا استعمال ہوتا ہے ان کو ضرور استعمال کریں تاکہ فضا میں تعفن پیدا نہ ہو۔

(۶) انسانیت اور آدمیت کا تقاضہ یہ ہے کہ ہر شخص اور ہر ذمہ دار شہری اپنے ماحول کو پاک وصاف رکھنے کی فکر کرے، اپنے محلے اور بستی میں صفائی کی مہم چلائے اور گندگی جمع نہ ہونے دے، وہ یہ بھی دیکھے کہ کہیں اس کی بے توجہی جراثیم پھیلانے اور پھیلنے اور فضا کو آلودہ کرنے کا سبب تو نہیں بن گئی ہے۔ اس کے گھر کے باہر ایسا کوڑا تو نہیں جو دوسروں کے لئے اذیت کا سبب ہے۔

کیا تھوک دان کا استعمال کرنا ضروری ہے ؟: تھوک بلغم وغیرہ کو جہاں تہاں پھینکنے سے ماحول کو نقصان پہنچتا ہے، خاص طور پر ان لوگوں کے تھوکنے سے جنھوں نے کوئی نقصان دہ چیز کھا رکھی ہو۔ اس کے حل کے لئے اکثر ملکوں میں عوامی مقامات پر تھوکنے پر پابندی عائد ہے اور ایسے مقامات پر تھوک دان بنائے گئے ہیں۔ اس لیے ایسی جگہوں پر جہاں حکومت نے اس کے انتظامات کر رکھے ہیں، تھوک دان کا استعمال کرنا واجب وضروری ہوگا۔ اس کی خلاف ورزی قانونا جرم سمجھی جائے گی، حکومت بے اصولی کرنے والوں پر اگر جرمانہ عائد کرتی ہے تو یہ جائز ہی نہیں بلکہ بہتر ہوگا۔ عوام الناس کو چاہے کہ ماحول کو خوشگوار اور سازگار بنانے کے لئے حکومت جو پالیسی طے کرے اور وہ شریعت سے متصادم نہ ہو تو اس پر ضرور عمل کریں۔

ماحول کے تحفظ کے سلسلے میں اسلام کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ گندگی پھیلانے سے پرہیز کیا جائے، خاص طور پر پبلک مقامات کو گندگی سے بچایا جائے، رسول اللہ ﷺ نے سایہ دار درخت کے نیچے، راستہ میں اور مسجد میں گندگی پھیلانے سے شدت سے منع فرمایا ہے:

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دو ایسی چیزوں سے پرہیز کرو جو لعنت کا سبب ہیں، صحابہ نے پوچھا: وہ لعنت کرنے والی چیزیں کیا ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں کے راستہ میں اور سایہ میں غلاظت کرنا۔ (مسلم شریف)۔

حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: مسجد کے اندر بلغم جھاڑنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اسے دفن کر دینا ہے۔

ان احادیث میں مسجد کی تخصیص مزید شناعت کے لئے ہے، ورنہ ہر عمومی جگہ کا حکم یہی ہوگا۔ (صحیح مسلم ۵۵۲)۔

الغرض اسلام کی جامع تعلیم یہ ہے کہ کھلے عام گندگی نہ پھیلائی جائے کیوں کہ اس سے فضا مکدر اور مسموم ہوتی ہے۔

آپ ﷺ نے بلغم اور تھوک کے بارے میں فرمایا کہ مسجد کے اندر اس کا جھاڑنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ اسے دفن کرنا ہے۔ اس سے تھوک دان وغیرہ کے استعمال کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، اگر آپ ﷺ کی جامع تعلیمات آج دنیا اپنا لے تو ماحولیات کا سارا

مسئلہ آسانی کے ساتھ حل ہوسکتا ہے۔

مشینی اشیاء جو شعاعوں کو جنم دیں ان کے استعمال کا شرعی حکم: ایسی مشینی اشیاء جو کثرت سے شعاعوں کو جنم دیتی ہیں اور جو انسانوں جانداروں نیز ماحول کے لئے نقصان کا سبب اور باعث ہوتی ہیں، ایسی اشیاء کا استعمال ضرورت کی حد تک ہونا چاہیے۔ مشینی اشیاء کے کثرت استعمال کی وجہ سے آج انسان بھی مشینی انسان کی طرح بن گیا ہے، باسی کھانے کا تصور پہلے زمانہ میں نہیں تھا آج تقریبا نصف سے زیادہ لوگ فریج میں کھانا رکھ کر باسی کر کے کھاتے ہیں جس کا انسانی صحت پر غلط اثر پڑتا ہے۔ انسان کھلی فضا میں سانس نہیں لے رہا ہے، وہ ہر وقت بجلی کی شعاعوں میں رہتا ہے اور وہ شعاعیں اتنی تیز ہوتی ہیں کہ ان سے جسم پر، خاص کر نازک اعضاء پر انتہائی منفی اثر پڑتا ہے، غالبًا ایسی ہی تیز شعاعوں کے بارے میں قرآن نے اشارہ دیا ہے:

یکاد البرق یخطف ابصارھم قریب ہے کہ بجلی کی تیز شعاعیں لوگوں کی نگاہوں کو چکا چوند نہ کر دیں۔

دوسری طرف اس پہلو پر بھی نظر رہے کہ ماحول کے تحفظ میں پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کا بھی حصہ ہے، ان کے وجود سے فضا اور ماحول پر خوشگوار اثر پڑتا ہے، جدید سائنس کی تحقیق بھی یہی ہے کہ نجاست کے اثرات کو ختم کرنے کے لیے چیل، گدھ شکرہ اور بہت سے ایسے پرندے جو نجاست خور ہیں ان کا وجود انتہائی ضروری ہے لیکن جب سے ہوٹل کے استعمال کی کثرت ہوئی ہے پرندے ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے وقت میں حکومت کی ذمہ داری ہے کہ پرندے ختم نہ ہونے پائیں، اس کے لئے موثر اقدامات کرے، ماحول کی حفاظت میں اس کی کتنی اہمیت ہے ذرائع ابلاغ کے ذریعہ اس کی تشہیر کرائے اور عوام الناس کو اس سے واقف کرائے۔ مشینی اشیاء کے استعمال کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے پبلک کو روشناس کرائے۔ دوسری طرف عام الناس کی ذمہ داری ہے کہ کسی بھی چیز کے استعمال میں حد سے زیادہ تجاوز نہ کریں، ٹی وی اور موبائل کے جو خطرناک طبی نقصانات سامنے آرہے ہیں ان سے اپنی اولاد کو آگاہ کریں اور ان مشینی اشیاء کے استعمال سے جو سائیڈ ایفکٹ ہو رہا ہے اس سے بھی واقف کرائیں، ان اشیاء کا استعمال ضرورت ہی کی حد تک رہے، اس کو یقینی بنانے کے لئے عوامی بیداری مہم بھی چلائی جائے۔

بلا ضرورت جنگلات کے کاٹنے کا حکم: یہ حقیقت ہے کہ پیڑ پودے، جنگلات اور باغات قدرت الٰہی کے وہ عطیے ہیں جن سے انسانی زندگی کے بہت سے مفادات وابستہ ہیں۔ یہ ماحول کو سازگار بنانے اور موسم وفضا کو معتدل رکھنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ آج ماحولیاتی آلودگی کی وجہ سے جو حالات سامنے آرہے ہیں اور جو نئی نئی بیماریاں جنم لے رہی ہیں ان کے ازالے کے لئے ماہرین اور سائنس دان اس بات پر زیادہ توجہ اور دھیان مبذول کرا رہے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ شجر کاری کی جائے، جنگلات کی کٹائی پر پابندی لگائی جائے، ان حقائق کی روشنی میں یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ بلا ضرورت جنگلات کاٹے جائیں اور زیادہ سے زیادہ روپیوں کے حصول کے لئے کھیتوں کو پلاٹس بنا کر انسانوں کو بسایا جائے۔ کیوں کہ جس رفتار سے یہ پیڑ برباد ہو رہے اور جنگلات کا خاتمہ کیا جا رہا ہے اسی رفتار سے موسمی بلائیں آرہی ہیں۔

آنحضرت ﷺ نے تاکید فرمائی کہ بلا ضرورت پیڑوں کو نہ کاٹو تمام پیڑ انسان اور حیوانات دونوں کی راحت رسانی کا کام کرتے ہیں، غور کا مقام ہے کہ حدودِ حرم میں پیڑوں کا کاٹنا، جانوروں کو مارنا ممنوع ہے، آنحضرت ﷺ جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ ﷺ نے فرمایا: جس طرح حضرت ابراہیم نے مکہ کو حرم بنایا تھا اسی طرح میں بھی مدینہ کو حرم قرار دیتا ہوں، نہ تو یہاں پیڑوں کو کاٹا جائے اور نہ جانوروں کو ہلاک کیا جائے۔ ایندھن کے لئے لکڑیاں اور جانوروں کا چارہ اس سے علیحدہ قرار دیا گیا۔ جنگ میں بہت سی چیزوں کو فریقین اختیار کرتے ہیں جو غیر اخلاقی اور غیر انسانی ہوتی

ہیں، تاکہ دشمنوں پر قابو پایا جاسکے مگر قربان جائیے نبی امی ﷺ پر کہ آپ نے جنگ میں بھی پیڑوں پودوں کو کاٹنے سے منع فرمایا۔

اسلام میں درخت لگانے اور کاشت کرنے کی اھمیت: اسلام کی نظر میں درخت لگانے اور کاشت کرنے کی بڑی اہمیت اور فضیلت ہے، کیوں کہ ماحول میں شادابی و ہریالی اور موسم کی سازگاری انسانوں اور جانوروں کے لئے انتہائی ضروری ہے۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے پیڑ پودوں کو لگانے کی اہمیت کا احساس دلایا، حضرت انس بن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فرمایا: "ما من مسلم يغرس غرسا او يزرع زرعا فيأكل منه انسان او طير او بهيمة الا كانت له صدقة" (ترمذی) ''جو مسلمان کوئی پیڑ لگاتا ہے یا کاشتکاری کرتا ہے اور اس پیڑ پودے سے انسان، پرندے یا جانور کھاتے ہیں تو یہ پیڑ لگانے والے کے لئے صدقہ ہے''۔

شجر کاری کو رسول اللہ نے اتنی اہمیت دی کہ قیامت تک اس کام کو کرتے رہنے کی ہدایت فرمائی، آپ ﷺ نے فرمایا: إن قامت الساعة وبيد احدكم فسيلة واستطاع أن لا تقوم حتى يغرسها فليغرسها فان له فى ذلك أجرا" (عمدۃ القاری بحوالہ ترجمان الاسلام، جولائی، ستمبر، ۲۰۰۳) ''اگر قیامت کا وقت آجائے اور تم میں سے کسی شخص کے ہاتھ میں کھجور کا پودا ہو اور قیامت کے برپا ہونے سے پہلے وہ اسے لگا سکتا ہو تو ضرور لگا دینا چاہیے کیوں کہ اس شجر کاری پر اجر ملے گا''۔

خود قرآن مجید نے تعلیم دی کہ زیادہ سے زیادہ شجر کاری کی جائے چنانچہ فرمانِ خداوندی ہے۔ وهو الذى انزل من السماء ماء فأخرجنا به نبات كل شيء فأخرجنا منه خضرا (الانعام:۹۹) ''اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا، پھر ہم نے اس سے ہر چیز کے کونپل نکالے، پھر ہم نے اس سے سرسبز شاخیں ابھاریں''۔

یہ آیت ہمیں سبزہ کے اسباب پیدا کرنے کی طرف توجہ دلا رہی ہے۔ سبزہ کے تحفظ کا تصور سب سے پہلے نبی کریم ﷺ نے دیا چنانچہ مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جو کسی بیری کے درخت کو کاٹے گا، اللہ تعالیٰ جہنم میں اس کے سر کو اوندھا کردے گا''۔ (سنن ابی داود حدیث نمبر ۵۲۳۹)

آپ ﷺ نے شجر کاری اور کاشت کاری کی لوگوں کو صرف زبانی تعلیم ہی نہیں دی بلکہ خود اس پر عمل کر کے دکھایا۔ چند روایات پیش کی جاتی ہیں۔ جن معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے خود اپنے دستِ مبارک سے درخت اور پیڑ لگائے اور وہ پیڑ برگ و بار بھی لائے۔

مدینہ سے بیس میل کی دوری پر وادی عقیق میں رسول اللہ ﷺ نے گھوڑوں کے لئے ایک چراہ گاہ بنائی۔ جس کا نام "حمی النقیع" تھا، اس چراہ گاہ میں آپؐ نے پودے لگوائے، سبزیاں لگوائیں، کچھ عرصہ بعد اس وادی میں اتنی ہریالی ہوگئی کہ گھوڑوں کی چراہ گاہ ہی نہ رہی بلکہ انسانوں کی سیر گاہ بھی بن گئی۔ اس سیر گاہ کے حدود رسول پاک ﷺ نے اس طرح مقرر فرمائے کہ ایک شخص کو کھجور کے پیڑ پر چڑھ کر بلند آواز لگانے کو کہا، آواز کی گونج جہاں تک سنائی دی وہاں تک اس کے حدود مقرر ہوئے۔ نبی عربی ﷺ کی یہ عملی اور علمی مثالیں ماحولیات کے تحفظ کے سلسلے میں پوری دنیا کے لوگوں کے لئے بصیرت اور مہمیز کا کام دیتی ہیں۔

ان تفصیلات کی روشنی میں یہ بات بالکل بے غبار ہوگئی کہ بلا ضرورت جنگلات کو کاٹنے اور کھیتوں کو زیادہ سے زیادہ پیسوں کے حصول کے لئے پلاٹس بنا کر آباد کرنا از روئے شرع جائز نہیں ہے، حکومت کو اس سلسلے میں سخت نوٹس لینا چاہیے، اور حکومت اسلامی ہو یا غیر اسلامی انسانیت کے مفاد کے لئے جو بھی اقدام کرے، اس میں ملک کے ہر باشندے کا حصہ لینا ضروری ہے اور حکومت کا تعاون کرنا ان کا فرضِ منصبی ہے۔

☆☆☆

❑ اسلامی تعلیمات

اسلام میں حقوق حیوانات

مولانا کلیم اللہ عمری مدنی

اسلام دین رحمت ہے، اس کی رحمت انسان کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر ذی روح پر محیط ہے۔ اس کے ابر کرم نے جہاں عالم انسانیت کو سیراب کیا ہے وہیں بے زبان جانوروں کو بھی اپنی رحمت بے کراں سے مالا مال فرمایا۔ اسلام سے پہلے اہل عرب کی قساوت، سنگ دلی اور ظلم وستم کا نشانہ انسان کے علاوہ جانور بھی بنتے تھے، وہ مختلف طریقوں سے جانوروں کو ایذا دیتے اور ان پر ظلم ڈھاتے تھے۔ جانوروں کو اندھا دھند مار گرانا، پھر لوگوں کو دعوتِ طعام دینا ان کے پاس فیاضی کی علامت تھی۔ ان کے یہاں جانوروں کو کثرت سے ذبح کرنے کے معاملے میں بھی مقابلے ہوا کرتے تھے، جس میں دوفریق باری باری اونٹ ذبح کرتے جاتے تھے، جو رک جاتا یا جس کے اونٹ ختم ہوجاتے وہ بازی ہار جاتا تھا۔ ایک دستور یہ بھی تھا کہ کوئی شخص مرجاتا تو اس کی سواری کے جانوروں کو اس کی قبر پر بھوکا پیاسا باندھ دیا جاتا تھا، ان کے لیے نہ چارے کا انتظام کیا جاتا اور نہ پانی کا، اسی حالت میں وہ جانور سوکھ کر مرجاتا تھا۔ یہ اور اس طرح کے دسیوں سنگ دلی اور ظلم کے مظاہرے عرب جاہلیت میں جانوروں کے ساتھ روا رکھے جاتے تھے۔ اسلام آیا تو اس نے جاہلیت کی ان سارے خرافات کو ختم کرنے کا حکم دیا کہ جانوروں کے ساتھ بھی بہتر سلوک کیا جائے کہ جس طرح انسان حسنِ سلوک کے مستحق ہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو مسلمان درخت لگاتا ہے، یا کھیتی باڑی کرتا ہے اور اس کو چڑیا یا انسان یا کوئی جانور کھاتا ہے تو یہ (بھی) صدقہ (یعنی ثواب کا کام) ہے''۔ (مسلم:۳۹۶۹) اتنا ہی نہیں بلکہ جانوروں کے ساتھ حسن سلوک پر اجر وثواب کی خوشخبری بھی سنائی گئی۔ سنن ابن ماجہ کی حدیث ہے، ایک صحابی رسول اکرم ﷺ سے دریافت کرتے ہیں کہ میں نے بطور خاص اپنے اونٹوں کے لیے ایک حوض بنا رکھا ہے، اس پر بسا اوقات بھولے بھٹکے جانور بھی آجاتے ہیں، اگر میں انہیں بھی سیراب کردوں تو کیا اس پر بھی مجھے ثواب ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''(ہاں) ہر پیاسے یا ذی روح کے ساتھ حسن سلوک کرنے سے ثواب ملتا ہے''۔ (ابن ماجہ:۳۶۸۶)۔

حضرت ابوہریرہؓ سے ایک حدیث مروی ہے، جس میں نبی کریم ﷺ نے ایک شخص کا واقعہ بیان کیا ہے، جس کی حالت پیاس سے دگرگوں ہوگئی تھی۔ وہ ایک کنویں سے سیراب ہوکر باہر نکلا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہے کہ ایک کتے کا بھی پیاس سے ویسا ہی برا حال ہے جیسا کہ اس کا تھا۔ اور وہ کیچڑ کو چاٹ کر اپنی پیاس بجھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ شخص پھر کنویں میں اتر کر اپنے موزوں میں پانی بھر لایا اور کتے کو سیراب کردیا۔ اللہ کو اس کی یہ ادا اس قدر بھائی ہے کہ وہ اس کی مغفرت فرمادیتا ہے۔ اس واقعہ کو سن کر صحابہ کرام نے پوچھا: اللہ کے رسول! جانوروں کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور ان پر رحم کھانے میں بھی ہمارے لیے اجر

ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: فی کل کبد رطبة اجر ۔ ہر ایک تر جگر (یعنی ذی روح کے ساتھ حسن سلوک کرنے) میں اجر ہے''۔ (بخاری: ۶۰۰۸۔ابوداؤد: ۲۵۵۰)۔

اسلام نے جانوروں کے ساتھ حسن سلوک کی جو تعلیمات دی ہیں اور ان کے جو حقوق بیان کیے ہیں، ان میں سے چند کا ذکر ذیل میں کیا جارہا ہے:

جانوروں کو نہ ستایا جائے : اسلام نے جانوروں کو بھی چین سے جینے کا حق دیا ہے۔اس کی اصولی تعلیم یہ ہے کہ نہ خود تکلیف اٹھاؤ اور نہ ہی دوسروں کو تکلیف پہنچاؤ: لا ضرر ولا ضرار۔ (ابن ماجہ: ۳۴۰) دوسروں کو تکلیف دینا اگر چہ کہ وہ جانور ہی کیوں نہ ہو اسلام کے نزدیک درست نہیں ہے۔حضرت ربیع بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک سفر میں ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ اپنی حاجت کے لیے باہر تشریف لے گئے۔ہم نے ایک سرخ پرندہ دیکھا جس کے ساتھ اس کے دو بچے بھی تھے۔ ہم نے ان بچوں کو پکڑ لیا، تو وہ فرط غم سے ان کے گرد منڈلانے لگا۔اتنے میں نبی کریم ﷺ تشریف لائے تو آپ نے فرمایا: اس پرندے سے اس کے بچوں کو چھین کر کس نے اسے رنج پہنچایا؟ اس کے بچوں کو لوٹا دو.....اس کے بچوں کو لوٹا دو''۔ (ابوداؤد: ۲۶۷۵)

جانوروں کو ایذا پہنچانا تو دور کی بات ہے انہیں لعنت وملامت کرنے سے بھی اسلام نے منع فرمایا ہے۔حضرت عمران بن حصینؓ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ سفر پر تھے ۔ ایک انصاری عورت اونٹنی سوار (اونٹنی سے) تنگ دل ہوگئی تو اس نے اس پر لعنت کی ۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے سنا تو فرمایا: اس اونٹنی پر جو سامان لدا ہوا ہے، وہ اتار لو اور اسے (اس کے بدلے میں آزاد) چھوڑ دو، اس لیے کہ اس پر لعنت کی گئی ہے۔حضرت عمرانؓ فرماتے ہیں کہ میں اب بھی اس اونٹنی کو دیکھ رہا ہوں، وہ لوگوں کے درمیان چل رہی ہے، کوئی اس سے تعرض نہیں کر رہا ہے۔ (مسلم: ۶۶۰۴)

اس حدیث کی تشریح میں حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں: ''اس سے معلوم ہوا کہ تنگ دل ہو کر انسانوں کو تو کجا، جانوروں کو بھی بددعا دینا اور ان پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے''۔ (ریاض الصالحین: ۳۴۴/۲)۔

بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو جانور انسانوں کے لیے فائدہ پہنچاتا ہے اس کی قدر کی جانی چاہیے ۔ جیسا کہ حضرت زید بن خالد جہنیؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''مرغ کو برا بھلا مت کہو، اس لیے کہ وہ صبح سویرے اپنے بانگ کے ذریعہ تمہیں نماز کے لیے بیدار کرتا ہے''۔ (مسند احمد: ۱۹۲/۵۔۱۱۵/۴) یعنی جو جانور جس کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اس سے وہی کام لیا جائے : جانوروں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف پسندی کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس جانور کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا ہے اس سے وہی کام لیا جائے ، اس سے ہٹ کر اگر کوئی شخص اس سے دوسرا کام لیتا ہے تو یہ اس کے ساتھ زیادتی ہے۔مثلاً: اللہ نے بیل کو کھیتی باڑی کے لیے پیدا کیا ہے، اگر کوئی اس سے گدھے کی طرح بوجھ ڈھونے کا کام لیتا ہے تو اسلام کے نزدیک یہ ظلم ہے۔

ایک مرتبہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اپنے جانوروں کی پیٹھ کو منبر نہ بناؤ (یعنی جانور سے اسٹیج کا کام نہ لو)، اللہ نے انہیں تمہارا فرماں بردار صرف اس لیے بنایا ہے کہ وہ تم کو ایسے مقامات پر آسانی سے پہنچا دیں جہاں تم بڑی مشقت سے پہنچ سکتے تھے۔تمہارے لیے اللہ نے زمین کو پیدا کیا ہے، اپنی ضرورتیں اس سے پوری کرو''۔ (ابوداؤد: ۲۵۶۷).....آپ سے یہ بھی مروی ہے کہ ایک شخص بیل سے سواری کا کام لے رہا تھا۔(اللہ کی قدرتِ خاص سے بیل کو گویائی مل گئی تو) اس نے کہا: انی لم أخلق لهذا ۔ (بخاری: ۳۴۷۱) ''میری تخلیق اس کام کے لیے نہیں ہوتی ہے''۔

جانوروں کے آرام وراحت کا بھر پور خیال

رکھا جائے : جن جانوروں سے خدمت لی جاتی ہے، یا جن سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے، ان کے تعلق سے اسلام کی یہ تعلیم ہے کہ ان کے آرام وراحت کا پورا پورا خیال رکھا جائے، انہیں بروقت کھلا یا پلا جائے ،اگر وہ بیمار ہوں تو ان کا علاج معالجہ کرایا جائے، ان سے تکلیف کی حالت میں کام نہ لیا جائے، ان کے رہنے سہنے کا مناسب بندوبست کیا جائے اور ان سے اتنا ہی کام لیا جائے جس کے وہ متحمل ہوں، لیکن اس وقت تک کام لینا جب تک کہ وہ بری طرح تھک کر آگے کام کرنے کے لائق نہ رہ جائیں، یا ان کی حالت قابل رحم ہونے کے باوجود مار مار کر ان سے کام لینا، یا انہیں بھوکا پیاسا رکھ کر کام لینا یہ سراسر ظلم ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر سرسبز وشاداب موسم میں سفر کرو تو (اپنی سواری کو) آہستہ چلاؤ، اور جانور کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع دو اور قحط کا موسم ہو تو تیز تیز چلاؤ (تاکہ وہ منزل پر جلد پہنچے اور اسے کھانے پینے اور آرام کا موقع ملے)۔ (ابوداؤد: ۲۵۶۹)۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ ایک انصاری کے باغ میں رفع حاجت کے لیے تشریف لے گئے، اس میں ایک اونٹ تھا جو آپ ﷺ کو دیکھ کر بلبلایا اور آبدیدہ ہوگیا۔ آپ اس کے پاس گئے اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا، اور (حاضرین سے) پوچھا: یہ کس کا اونٹ ہے؟ ایک انصاری نوجوان نے آگے بڑھ کر کہا: میرا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کیا اس جانور کے بارے میں اللہ سے ڈرتے نہیں جس کا مالک اللہ نے تمہیں بنایا ہے؟ اس اونٹ نے مجھ سے شکایت کی ہے کہ تم اسے بھوکا رکھتے ہو اور اس پر سختی کرتے ہو"۔ (ابوداؤد: ۲۵۴۹) ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے ایک اونٹ کو دیکھا جس کی پیٹھ اس کے پیٹ سے لگی ہوئی تھی۔ آپ نے فرمایا: **اتقوا اللہ فی ھذہ البھائم المعجمۃ فارکبوھا صالحۃ واترکوھا صالحۃ.** (ابوداؤد: ۲۵۴۸) "ان بے زبان جانوروں کے معاملے میں اللہ سے خوف کھاؤ، ان پر ایسی حالت میں سواری کرو جب کہ یہ اس کے قابل اور صحت مند ہوں اور انہیں اچھی حالت ہی میں (تھک کر چور ہونے سے پہلے) چھوڑو"۔

بلا ضرورت جانورو ں کا قتل نہ کیا جائے :

اسلام نے بلاضرورت جانوروں کو مارنے اور قتل کرنے کو بھی جرم قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی نے اگر چڑیا، یا اس سے بھی کسی چھوٹے جانور کو ناحق ذبح کیا تو عنداللہ اس سلسلہ میں اس سے پوچھا جائے گا۔ صحابہ نے حیرت سے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! اس کا حق کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اسے ذبح کرے تو کھالے، یہ نہیں کہ اسے کاٹ کر پھینک دے۔ (مستدرک حاکم)۔

جانوروں کو احسن طریقے سے ذبح کیا جائے : جانوروں میں سے بعض جانور ایسے ہیں جو انسان کے لیے غذا کا کام دیتے ہیں۔ اسلام نے انہی جانوروں کو بوقت ضرورت ذبح کرنے کا حکم ہے۔ اس کی یہ بھی تعلیم ہے کہ ان جانوروں کو ذبح کرنے کی ضرورت پیش آجائے تو بھلے طریقے سے ذبح کیا جائے، یہ نہیں کہ اذیت دے کر بھوکا پیاسا اور بالکل بے دردانہ انداز میں ذبح کرے، یا ذبح کیے بغیر جھٹکے سے انہیں مار ڈالے۔ حضرت شداد بن اوسؓ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی ارشاد فرمائی ہوئی دو باتیں (خصوصی طور پر) یاد رکھی ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا: **ان اللہ کتب الاحسان علی کل شیٔ فاذا قتلتم فاحسنوا القتلۃ واذا ذبحتم فأحسنوا الذبحۃ ولیحد احدکم شفرتہ فلیر ح ذبیحتہ** .(مسلم: ۵۰۵۵) "اللہ تعالی نے ہر کام میں بھلائی اور خوبی فرض کی ہے۔ جب قتل کرو تو اچھے طریقے سے قتل کرو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقے سے ذبح کرو۔ تم میں سے جو کوئی ذبح کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ چھری کو تیز کرلے اور اپنے جانور کو (حتی الامکان) آرام پہنچائے"۔

بعض روایتوں میں جانور کے سامنے چھری تیز کرنے سے اور

ایک جانور کے سامنے دوسرے جانور کو ذبح کرنے سے منع کیا گیا، محض اس لیے کہ اس سے جانور کو تکلیف ہوتی ہے۔

عذر شرعی کے بغیر کسی جانور کو بھوکا نہ رکھا جائے : جس طرح اپنے ماتحت انسانوں کو بھوکا پیاسا رکھنا گناہ ہے، اسی طریقے سے جانوروں کو بھوکا پیاسا رکھنا گناہ ہے اور یہ سنگ دلی جہنم تک پہنچا سکتی ہے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دخلت امرأة النار فی هرة ربطتها فلم تطعمها ولم تدعها تا كل من خشاش الارض. (مسلم: ۲۲۷۵) ''ایک عورت ایک بلی کی وجہ سے جہنم میں ڈالی گئی، اس نے اسے باندھ رکھا تھا۔ نہ تو اس نے اسے کچھ کھانے کو دیا اور نہ اسے آزاد کیا کہ وہ (چل پھر کر) حشرات الارض میں سے کچھ کھا لیتی''۔

زندہ جانوروں کا گوشت کاٹ کر کھایا نہ جائے اور نہ جانوروں کا مُثلہ کیا جائے : اہل عرب کی شقاوت قلبی کی حد ہوگئی کہ وہ زندہ جانور کے جسم کا من پسند حصہ کاٹ کر کھالیا کرتے تھے۔ آپ ﷺ نے اس سے سختی سے منع فرمایا کہ ''اس طریقہ سے زندہ جانوروں کا جو گوشت کاٹ کر کھایا جاتا ہے وہ مردار ہے''۔ (ترمذی: ۱۴۸۰) اسی طرح جانوروں کا مثلہ کرنے (یعنی ان کے کسی عضو کے کاٹنے) سے منع فرمایا اور ایسا کرنے والے پر لعنت بھیجی۔ (بخاری: ۵۵۱۵)۔

جانوروں کو نشانہ بازی کے لیے استعمال نہ کیا جائے : کسی جانور کو نشانہ بازی کے لیے استعمال کرنے یا اسے باندھ کر نشانہ بنانے سے اسلام نے سختی سے روکا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: لاتتخذوا شيئاً فيه الروح عرضا. (مسلم: ۵۰۵۹) ''تم کسی جاندار کو ہرگز نشانہ مت بناؤ''۔ ایک دوسری روایت میں ہے: نهى رسول ﷺ ان تصبر البهائم. (مسلم: ۵۰۵۷) ''رسول اللہ ﷺ نے جانوروں کو باندھ کر مارنے سے منع فرمایا ہے''۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ کچھ لڑکے مرغی کو باندھ کر تیر کا نشانہ بنا رہے تھے۔ آپ نے آگے بڑھ کر رسی کھولی اور مرغی سمیت اس لڑکے کو پکڑ کر اس کے گھر والوں کے پاس پہنچے اور ان سے کہا: اپنے بچے کو اس قسم کی بے رحمانہ حرکت سے باز رکھو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس طریقے سے کسی جانور یا کسی ذی روح کو نشانہ بنانے سے منع فرمایا ہے۔ (بخاری، ۵۵۱۴)۔

جاندار کے چہرے پر مارنے اور اس پر داغنے سے باز رہا جائے : چہرہ جسم کا نہایت لطیف اور حساس مقام ہے، اس عضو کو پہنچنے والی معمولی اذیت بھی بے حد تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اہل عرب چوپایوں کے چہروں پر داغ لگاتے تھے اور بسا اوقات چہروں پر مار بھی دیا کرتے تھے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس سنگ دلی کو دیکھا تو سختی سے روکا۔ (ابوداؤد: ۲۵۶۴)

حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے چہرے پر مارنے اور اسے داغ دینے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا۔ (مسلم: ۵۵۵۱)۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کا گزر ایک دفعہ ایک گدھے پر سے ہوا، جس کے چہرے کو داغا گیا تھا۔ آپ نے دیکھا تو فرمایا: اس شخص پر اللہ کی لعنت ہو جس نے اسے داغا ہے''۔ (مسلم: ۵۵۵۲)

جاندار کو آگ میں نہ جلایا جائے : ایک دفعہ آپ ﷺ صحابہ کے ساتھ کسی سفر کے پڑاؤ میں تھے۔ آپ ضرورت سے کہیں تشریف لے گئے تھے، جب واپس آئے تو دیکھا کہ ایک صاحب نے اپنا چولہا ایسی جگہ جلایا ہے جہاں زمین میں (یا درخت پر) چیونٹیوں کا بل تھا۔ یہ دیکھ کر آپ نے پوچھا: یہ چولہا یہاں کس نے جلایا ہے۔ ان صاحب نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے۔ آپ نے فرمایا: اسے بجھاؤ، اسے بجھاؤ۔

(ابوداؤد:۲۶۷۵) (غرض یہ تھی کہ ان چیونٹیوں کو تکلیف نہ ہو اور کہیں وہ جل نہ جائیں)۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ (ایک سفر میں) آپ نے چیونٹیوں کا ایک بل، جسے ہم نے جلادیا تھا، دیکھ کر پوچھا: یہ حرکت کس نے کی ہے؟ ہم نے جواباً اپنے آپ کو پیش کیا تو آپ نے فرمایا: کسی ذی روح کو آگ کا عذاب دینا صرف آگ کے پروردگار ہی کو سزاوار ہے''۔ (بخاری:۳۰۱۶)۔

جانوروں کو باہم نہ لڑایا جائے: عربوں کا ایک دلچسپ مشغلہ تھا کہ وہ جانوروں کو آپس میں لڑاتے اور اس تماشے کو سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس بازی میں جانور گھائل اور زخمی ہوکر بے حد تکلیف اٹھاتے تھے، رسول اللہ ﷺ نے اس درندگی کو دیکھا تو سختی کے ساتھ اس سے روکا ہے۔ (ابوداؤد:۲۵۶۲)

موذی جانوروں کو مارنے کا حکم: اسلام نے ہر اس جانور کو مارنے کی اجازت، بلکہ حکم دیا ہے جو انسانوں کے لیے موذی ہو، اس کا مقصود انسانی جان کا تحفظ ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ فرماتے ہیں، کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **خمس قتلهن حلال فی الحرم الحية والعقرب والحدأة والفأرة والكلب العقور.** (ابوداؤد:۱۸۴۷) ''پانچ حیونات ایسے ہیں جن کا قتل حدود حرم میں بھی جائز ہے۔ سانپ، بچھو، چیل، چوہا اور باؤلا کتا''۔

اسلام میں جانوروں کے حقوق کے سلسلے کی یہ واضح تعلیمات تھیں، جن سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ اسلام نے جانوروں کو کس قدر احترام کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ بقول مولانا سید سلیمان ندویؒ: ''ان تعلیمات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام کے سینہ میں جو دل ہے وہ کتنا نرم اور کس قدر رحم وکرم سے بھرا ہوا ہے''۔

دنیا کو سب سے پہلے ''حقوق حیوان'' سے آشنا کرنے والا ''اسلام'' ہی تھا، ورنہ اس سے پہلے ''حقوق حیواں'' کا تصور دنیا میں نہیں تھا۔ ہو بھی کیسے سکتا تھا؟ جس دنیا میں ''حقوق انسان'' ہی کے لالے پڑے ہوں وہاں ''حقوق حیوان'' کا تصور ناممکن ہی تو تھا؟

اسلام دین رحمت ہے اور اس نے تمام مخلوقات کے ساتھ رحم دلی کی تعلیم دی ہے، ان میں ایک حیوانات بھی ہیں، یہ انسان کے لئے بہت بڑی نعمت ہیں، جو بار برداری کے کام آتے ہیں، جن کے چمڑوں سے مختلف ضروری اشیاء تیار کی جاتی ہیں، جن کے بعض اجزاء سے دوائیں بنائی جاتی ہیں، یہ ماحولیات کو درست رکھنے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں، اور ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جن کو اللہ تعالی نے حلال قرار دیا ہے اور وہ ہماری غذائی ضروریات کو بھی پورا کرتے ہیں۔

اس وقت دنیا بھر میں جانوروں کو بچانے کی کوششیں کی جارہی ہیں؛ کیونکہ بعض جانوروں کی نسلیں ختم ہوتی جارہی ہیں اور ماحول پر اس کا منفی اثر پڑ رہا ہے؛ اسی لئے جانوروں کے تحفظ اور ان کو انسان کی ظلم وزیادتی سے بچانے کے لئے مختلف قوانین بنائے گئے ہیں، ہمارے ملک میں بھی سرکاری طور پر اس کا مستقل شعبہ قائم ہے، رسول اللہ ﷺ نے جہاں مختلف انسانی حقوق ذکر فرمائے ہیں، وہیں حیوانات کے حقوق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، اور فقہاء نے بھی شریعت کے مقاصد اور قرآن وحدیث کی تعلیم کو سامنے رکھتے ہوئے جانوروں کے حقوق کے بارے میں گاہے گاہے روشنی ڈالی ہے، جن کو موجودہ حالات اور ضروریات کے پس منظر میں واضح کرنے کی ضرورت ہے۔

جانوروں کے حقوق سے متعلق درپیش سوالات مع جوابات پیشِ خدمت ہیں:

۱- آج کل چارہ خور جانوروں کے لئے ایسی غذائیں تیار کی جارہی ہیں، جن میں لحمی اجزاء بھی شامل ہوتے ہیں؛ تاکہ وہ تیزی سے بڑھ سکیں، اور ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکے، جو ظاہر ہے کہ چارہ خور جانوروں کی فطرت کے خلاف ہے، تو کیا یہ

عمل جائز ہے؟

شرعی اصول یہ ہے کہ ماکولات ومشروبات میں ہر وہ پاکیزہ چیز حلال ہے جسے شریعت نے حلال قرار دیا ہے اور وہ چیز جسے شریعت نے ناپاک بتایا ہے وہ حرام ہے، ارشاد باری تعالی ہے **وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ** (الاعراف ،۱۵۷) ترجمہ۔ اور پاک چیزوں کو اُن کیلئے حلال کرتے ہیں اور ناپاک چیزوں کو اُن پر حرام ٹھہراتے ہیں۔

موجودہ حالات میں چارہ خور جانوروں کی خاطر ایسی غذائیں تیار کی جاتی ہیں جن میں لحمی اجزاء شامل ہوتے ہیں، جو چارہ خور جانورں کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں، بے شمار جانوروں کی موت بھی واقع ہوتی ہے، لہذا جو غذا بذات خود جانورں کے حق میں باعث نقصان ہوں، ایسی غذاؤں سے جانوروں کو پالنا شرعا درست نہیں ہے۔

۲- جانوروں سے زیادہ دودھ حاصل کرنے کے لئے اور بعض چھوٹے جانوروں کے گوشت میں اضافے کے لئے انہیں انجکشن لگائے جاتے ہیں، اس سے دودھ اور گوشت کی مقدار میں نمایاں اضافہ ہوجاتا ہے، اس کا کیا حکم ہوگا؟

محض دودھ یا گوشت میں اضافہ کی خاطر ہارمون بڑھانے والے انجکشن (OXY TOCIN INJECTION) کا استعمال جائز نہیں ہے، اطباء سے یہ بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ مذکورہ انجکشن کبھی کبھی لگانے کے بالمقابل ہمیشہ لگانا جانوروں کی ہلاکت کا باعث بنتا ہے، عصر حاضر میں اس طرح کے تباہ کن انجکشن اور دواؤں کا استعمال انسان کی صحت وتندرستی کے لئے بے حد مضر ثابت ہورہا ہے۔ شریعت میں دفع مضرت مقدم ہے جلب مصلحت پر، لہذا اس طرح کے انجکشنوں کا استعمال جائز نہیں ہے۔

۳- حلال جانوروں کے دودھ میں اضافہ یا اس کے جسمانی حجم کو بڑھانے کے لئے حرام جانور سے اس کا اختلاط کرایا جاتا ہے، خاص کر جرسی گائے کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ خنزیر کے اختلاط سے پیدا ہوتی ہیں؛ اسی لئے ان کے دودھ کی مقدار بہ مقابلہ دوسری گایوں کے کافی زیادہ ہوتی ہے، کیا ایک جانور کا اس طرح دوسری جنس کے جانور سے اختلاط کرانا درست ہوگا اور اگر ان میں سے ایک حلال اور دوسرا حرام ہو تو اس سے پیدا ہونے والے بچوں پر شرعا کیا اثر مرتب ہوگا؟

حلال جانور کا ایک حرام جانور سے اختلاط ناجائز ہے، جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے، **وأن لا تنزى الحمار على الفرس** (**سنن ابی داؤد ، ۸۰۸، صحیح**) یعنی گدھے کو گھوڑے سے یا اس کے برعکس اختلاط (جفتی) کرانا جائز نہیں ہے البتہ عمل اختلاط کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے حیوان کا جنس اور اس کا حکم دیکھا جائے گا، اگر وہ ماکول اللحم کے جنس سے ہو تو اس کا حکم بھی حلال جانور کا ہوگا ورنہ نہیں۔

۴- زینت کے طور پر بعض جانور پنجرے میں رکھے جاتے ہیں، جیسے: پرندے، ہرن وغیرہ، ان کو کھانا مقصود نہیں ہوتا اور نہ ان کی تجارت مقصود ہوتی ہے، کیا ان کو اس طرح رکھنا درست ہوگا؟

پالنے کے لئے پرندوں اور جانورں کو پنجروں میں رکھنا جائز ہے جیسا کہ احادیث شریفہ میں اس کا ثبوت ملتا ہے۔ **يا ابا عمير مافعل النغير** (صحیح بخاری، ۶۱۲۹) یعنی ایک صحابی ابوعمیر ایک پرندہ کو پالتے تھے، اتفاق سے وہ مرگیا تو نبی کریم ﷺ نے از راہ ہمدردی سوال فرمایا کہ اے ابوعمیر! تم نے اس پرندہ کے ساتھ کیا کیا؟ نیز نبی کریم ﷺ کے دور میں حضرت ابوہریرہؓ بلی پالتے تھے، نیز ابوقتادہؓ کے وضو کے پانی میں ایک بلی نے منہ ڈال دیا تو آپ ؓ نے اس پانی سے وضو کے جواز پر فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ **انها ليست بنجس وانما هي من الطوافين عليكم والطوافات** (**صحيح ابن خريمه . ۱۰۴**)۔ یعنی یقیناً یہ ناپاک نہیں ہے بلکہ یہ تمہارے پاس کثرت سے داخل ہونے

والوں اور داخل ہونے والیوں میں سے ہے۔

۵- انسان کے جذبات شوق کی بھی کوئی سرحد نہیں ہوتی، اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ بعض لوگ خطرناک جانوروں کو پنجروں میں بند کر کے یا باندھ کر رکھتے ہیں، جیسے: شیر، سانپ، خونخوار کتے، اگر کبھی بے قابو ہو جائیں تو بہت سی انسانی اور حیوانی جانوں کا نقصان ہو سکتا ہے، کیا اس طرح کا شوق پورا کرنے کی شرعاً گنجائش ہوگی؟

خطرناک جانوروں کو پنجروں میں بند رکھ کر شوق پورا کرنا جائز نہیں ہے، ارشاد باری تعالی ہے وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرة، ۱۹۵) ترجمہ -اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو-

۶- جانوروں پر میڈیکل تجربات بھی کئے جاتے ہیں، پہلے انہیں ایسے انجکشن لگائے جاتے ہیں، یا دوائیں دی جاتی ہیں کہ وہ بیمار ہوں، اور پھر ان کے علاج کے لئے امکانی دواؤں کا تجربہ کیا جاتا ہے، کیا اس طرح کے تجربات درست ہوں گے؟

اسلام نے جانوروں کو خواہ مخواہ مارنے اور اذیت دینے اور سامان تفریح کے طور پر استعمال کرنے سے منع فرمایا، دوسری طرف اسلام نے یہ تصور بھی پیش کیا کہ کائنات کی ہر چیز انسان کے فائدہ کے لئے مسخر ہے، جانوروں کی سواری، گوشت پوست، چمڑوں کو لباس یا کسی عضو کو انسان کی صحت کی خاطر اس کے جسم میں پیوند کاری کی اجازت دی ہے، بلکہ انسان کی ضروریات کو دیگر ضروریات پر ترجیح بھی دی ہے۔

صورت مسؤلہ میں از روئے شریعت انسان کی جان اور صحت وتندرستی جانوروں کی جان کی سلامتی سے زیادہ اہم اور مقدم ہے، لہذا مقصود کو مدنظر رکھ کر جانوروں پر میڈیکل تجربات کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نظر نہیں آتی۔

۷- کیا دواؤں کے لئے زندہ جانور کو بے ہوش کر کے اس کے کسی عضو کو نکال لینا یا آپریشن کر کے اس میں کوئی آلہ رکھ دینا جو جانور کے لئے باعث تکلیف ہو سکتا ہو، درست ہوگا؟

کسی زندہ جانور کو بے ہوش کر کے اس کے کسی عضو کو نکال لینا حرام ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمائی۔ **ما قطع من البهيمة وهي حية فهي ميتة** (سنن ابی داؤد، ۲۸۵۸. صحیح) یعنی جس زندہ چوپائے سے جو حصہ کاٹ لیا جاتا ہے اس کا حکم مردہ کا ہوگا۔ البتہ آپریشن کر کے اس میں کوئی آلہ رکھ دینا جو جانور کے لئے باعث تکلیف ہو سکتا ہو، درست ہوگا، کیونکہ جانوروں کی مصلحت سے زیادہ انسان کی مصلحت مقدم ہے، عام طور پر چوہوں یا پرندوں پر ریسرچ کیا جاتا ہے، مذکورہ مقصد کے تحت یہ عمل جائز ہوگا۔

۸- بعض جانوروں کی نسلیں ختم ہوتی جارہی ہیں، اور یہ بات ماحولیات کے لئے نقصان کا باعث بن رہی ہے، اس کی وجہ سے حکومت کی طرف سے اس کے شکار پر پابندی لگادی گئی ہے، اسی طرح بعض جانوروں کو ملک کی یا کسی ریاست کی حکومت قومی جانور قرار دے دیتی ہے، اور اس طرح کے جانوروں کے شکار کرنے اور ذبح کرنے کی ممانعت ہوتی ہے، یہ ممانعت شرعاً کس حد تک واجب العمل ہے؟

مذکورہ پابندی مصالح مرسلہ کے ضمن میں ہے، جانوروں کی حلت وحرمت اپنی جگہ، لیکن قانون کی پاسداری ہر شہری پر لازم ہے، ہر شہری اپنے قوانین کا پاس ولحاظ رکھے، کیونکہ یہ قوانین مصالحہ مرسلہ کے قبیل سے ہیں۔

۹- اگر مسلمان ملے جلے معاشرہ میں رہتے ہوں، جہاں کوئی گروہ کسی خاص جانور کو معبود اور مقدس مانتا ہو، اگر اس جانور کو ذبح کیا جائے تو اس سے ان کی دل آزاری ہوتی ہے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی متاثر ہوتی ہے، یا قانوناً اس کو ذبح کرنے کی پابندی ہے، تو مسلمانوں کا اس سلسلہ میں کیا رویہ ہونا چاہئے؟

جواب- صورت مسؤلہ میں جانوروں کے سلسلہ میں جب

شریعت میں بدیل موجود ہوتو ملک کے موجودہ حالات کا لحاظ رکھتے ہوئے دوسرے جانوروں کا ذبح کرنا ہی بہتر ہے، فتنہ اور شر سے بچنے کے لئے حدود میں رہتے ہوئے دیگر جانور، مثلا گائے کی جگہ بھینس، بکری اور اونٹ وغیرہ ذبح کرنا باعثِ خیر ہوگا۔

۱۰- حکومت جنگلات میں شکار سے منع کرتی ہے، بعض نہروں اور جھیلوں پر پرندوں کے شکار سے روکتی ہے؛ کیونکہ وہاں موسم کے لحاظ سے دور دراز علاقے کے پرندے آتے ہیں، جن کو' مہمان پرندہ' کہا جاتا ہے، ان سرکاری قوانین کی رعایت شرعاً کس حد تک واجب ہے؟

حکومت اگر بعض نہروں اور جھیلوں پر پرندوں کے شکار سے روکتی ہے تو ہر شہری کو ان قوانین کی پاسداری ضروری ہے، کیونکہ یہ مصالح مرسلہ کے قبیل سے ہے، گرچہ پرندوں کی حلت وحرمت اپنی جگہ مسلم ہے، حکومت کے قوانین کی وجہ سے حلت وحرمت میں فرق نہیں آئے گا بلکہ مصالح کے پیش نظر مذکورہ پابندیوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔

۱۱- بعض دفعہ وبائی متعدی امراض کو روکنے کے لئے بڑے پیمانے پر جانوروں کو مار دیا جاتا ہے، خاص کر مرغیوں کو مارنے کے واقعات بار بار پیش آتے رہتے ہیں، کبھی ان کو مارنے کے لئے گڑھوں میں زندہ دفن کر دیا جاتا ہے اور کبھی ان پر ایسڈ ڈال دیا جاتا ہے، تو امراض کے پھیلاؤ کے خوف سے کیا انہیں مارا جاسکتا ہے اور چونکہ یہ بڑی تعداد میں ہوتے ہیں تو ان کے مارنے کی کیا شکل اختیار کی جاسکتی ہے؟

وبائی متعدی امراض کو روکنے کے لئے حکومت کی طرف سے بعض جانوروں مثلا مرغیوں کو مارنے کا جو حکم دیا جاتا ہے، یہ بھی مصالح مرسلہ کے تحت قوانین بنائے جاتے ہیں، شرعاً انسان کی جان اور اس کی سلامتی جانوروں کی سلامتی پر مقدم ہے، بلکہ حضرت انسان کی جان اعلی وارفع اور اغلی ہے، نیز اھون البلیتین یا اخف الضررین کے اصول کے تحت ان جانوروں کو مارنا جائز ہے لیکن مارنے کا طریقہ ایسا ہو جس سے جانوروں کو کم سے کم تکلیف ہو، گڑھوں مین زندہ دفن کر دیا جانا یا ان پر ایسڈ ڈال دیا جانا جانوروں کے حق میں باعثِ تکلیف ہے لیکن ایسی کوئی دوا استعمال کی جائے جس سے جانور کم تکلیف کے ساتھ مر جائے تو بہتر ہوگا۔

۱۲- جانوروں کو کن انسانی مصالح کے لئے مارا جاسکتا ہے؟ جیسے ہاتھی کے دانت، ہرن کی سینگ اور کھال حاصل کرنے کے لئے وغیرہ۔

وبائی متعدد امراض کے پھیلنے کے امکانات ہوں، یا جانوروں سے انسانوں کو خطرہ لاحق ہو، مثلا ہاتھی پاگل ہوجائے، یا کتا پاگل ہوجائے یا شیر یا کوئی اور درندہ آبادی میں داخل ہو تو انسان کی جان بچانے کی خاطر ان موذی جانوروں کو مارنا جائز ہوگا یعنی دفع مضرت مقدم ہے جلب مصلحت پر، اسی اصول کے تحت ارشاد نبوی ﷺ ہے **خمس فواسق یقتلن فی الحل والحرم ،الحیة والغراب الأبقع، والفارة ،و الکلب العقور، والحدأة** (مسلم، ۱۱۹۸) پانچ شریر جانور ہیں جنہیں حل اور حرم میں بھی قتل کیا جاسکتا ہے، سانپ، کو (وہ مخصوص کوا جس کے پیٹ اور پیٹھ میں سفیدی ہوتی ہے) چوہا، کاٹنے والا کتا اور چیل۔

واللہ اعلم بالصواب۔

وصلی اللہ علی نبینا محمد وبارک وسلم والحمدللہ رب العالمین۔

☆☆☆

□ تاریخ کے جھروکوں سے

اورنگ زیب عالمگیرؒ-حقائق اور غلط فہمیاں

محمد خالد ضیا صدیقی ندوی
(رفیق امام بخاری ریسرچ اکیڈمی، علی گڑھ)

ہندوستان کے تخت پر جب انگریزوں کا ظالمانہ اور غاصبانہ قبضہ ہوا تو انھوں نے اپنی سیاسی مصلحت کی خاطر اس بات کی پوری کوشش کی ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی خوبصورت شبیہ کو بگاڑ دیا جائے، اوران کے وجود و کردار؛ بلکہ ان کے مذہب سے اس قدر نفرت دلائی جائے کہ ان کے مقابلے میں انگریزوں کی غاصبانہ حکومت کو لوگ رحمت الٰہی سمجھنے لگیں۔

جن مسلم حکمرانوں کے صاف وشفاف چہرے کو داغدار کرنے کی سب سے زیادہ کوشش کی گئی ان میں اورنگ زیب عالمگیرؒ سرفہرست ہیں، یہ وہ مظلوم حکمراں ہے جس کے وجود و کردار پر ہندو اور مغربی مؤرخین ایک عرصے سے حملہ آور ہیں اور اسے ایسا بدترین حکمراں ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس سے بدتر کوئی حکمراں سوچا نہیں جا سکتا، بقول سید صباح الدین عبدالرحمٰن:

''اورنگ زیب کو عام طور سے مسلمان بہت اچھا اور ہندو بہت برا سمجھتے ہیں، یہ بھی ہماری بدقسمتی ہے کہ ایک ہی ملک کے رہنے والوں کے لیے بہت اچھا اور بہت برا کا معیار علیحدہ ہو''۔(۱)

اس مضمون کے دو جز ہیں، ایک حصہ تو باپ اور بھائیوں کے معاملات اور ان سے متعلق الزامات وجوابات پر مشتمل ہے، اور دوسرے حصے میں ہم نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کے ہندوؤں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت کیا تھی؟ کیا واقعی وہ ہندو کش اور مندر شکن تھے؟ یا یہ صرف الزام تراشیاں اور غلط فہمیاں ہیں اور حقائق کچھ اور ہیں۔

اورنگ زیب عالم گیرؒ کے حالات زندگی کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ وہ ایک پابندِ شریعت، متقی، نیک طینت؛ بلکہ مرتبۂ ولایت پر فائز اور ہر طرح کی اخلاقی خوبیوں اور مذہبی پابندیوں کا جامع شخص تھا(۲) اسی لیے جب ایسی قابلِ رشک زندگی کے مرقع میں اس بات پر نظر جاتی ہے کہ ''**اس نے اپنے والد کو قید اور بھائیوں کو قتل کیا**'' تو اس کی صداقت میں شبہ ہونے لگتا ہے، اور یقین نہیں آتا کہ یہ واقعہ سچ مچ پیش آیا ہوگا؛ لیکن تاریخی حقائق کو کون مسخ کر سکتا ہے جب کہ ان کا تعلق مستند اور معتبر کتبِ تاریخ سے ہو۔

اب رہا یہ سوال کہ اورنگ زیب جیسے اطاعت شعار، نیاز منداور سعادت مند بیٹے نے اپنے والد کو قید کیوں کیا؟ کیا اس کا یہ اقدام صحیح تھا؟ کیا اس کا یہ فیصلہ دانش مندانہ تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جی! اس کا یہ فیصلہ مدبرانہ اور اس کا یہ اقدام حق بجانب تھا، بلکہ وہ اس اقدام کے لئے مجبور تھا؛ کیوں کہ شاہ جہاں نے اورنگ زیبؒ کو قتل کرنے کی ساری ترکیبیں اور تدبیریں کر رکھی تھیں اور موقع کی تلاش میں تھا؛ لیکن اورنگ زیبؒ کی بیدار مغزی اور ہوشیاری نے اس کے ناپاک خواب کو شرمندۂ تعبیر ہونے نہیں دیا اور حفاظتِ خود اختیاری کے طور پر اس کو قلعۂ آگرہ میں محبوس کر دیا،(۳) لیکن اورنگ زیب کا مقصد اس قید سے قیدِ دائمی نہیں قید عارضی تھا، جیسا کہ اورنگ زیب کے ایک خط سے پتہ چلتا ہے،(۴) قید خانہ بھی شاہ جہاں کے لئے شاہی ایوان سے کم نہ تھا؛ کیوں کہ اورنگ زیبؒ نے باپ کے لیے تمام تر سہولیات کا انتظام کروادیا تھا،(۵) اس

سے جہاں ایک سعادت مند بیٹے کا کردار سامنے آتا ہے، وہیں اس کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے کہ اورنگ زیبؒ حقوق پدری کا کتنا لحاظ کرتا تھا۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس موقعہ پر جو کچھ لکھا ہے وہ ''قول فیصل'' کا درجہ رکھتا ہے، لکھتے ہیں:

''عالمگیر کا نکتہ چیں اس موقعہ پر یہ کہہ سکتا ہے کہ عالمگیر نے جو کچھ کیا حفاظتِ خود اختیاری کی وجہ سے کیا؛ لیکن وہ جسونت سنگھ کو شکست دے کر آگرہ کے قریب پہنچ گیا، اور شاہ جہاں نے اس کو بار بار بلایا اور نہایت شفقت آمیز خط لکھے، تحفے اور انعام بھیجے اور سب سے بڑھ کر سلطنت کی تقسیم اس طرح کرنی چاہی جس سے بڑھ کر عالمگیر کے حق میں کوئی بات نہیں ہوسکتی تھی۔۔۔۔ تو اس حالت میں باپ کی نافرمانی کرنا، گستاخی سے پیش آنا اور آخر قلعہ میں بند کر دینا اخلاق کے مذہب میں کفر سے بدتر ہے؛ لیکن تحقیق طلب یہ ہے کہ کیا شاہ جہاں فی الواقع وہی کرنا چاہتا تھا جو کہتا تھا؟ اسلامی تعلق سے شاہ جہاں اور عالمگیر دونوں یکساں واجب التعظیم ہیں ..... میرا دل دکھتا ہے کہ ان میں سے کسی کو ملزم ٹھہراؤں؛ لیکن سچائی اور تاریخ نویسی کا کیا فرض ہے؟ شاہ جہاں اور عالمگیر دونوں قابلِ ادب ہیں، لیکن دونوں سے بڑھ کر بھی ایک چیز ہے ''حق اور راستی'' اور مجھ کو اسی اعلیٰ تر چیز کے سامنے گردن جھکا دینی چاہیے''۔(۶)

☆ جہاں تک معاملہ ہے مراد کے قتل کا، تو اس سلسلے میں سچی بات یہ ہے کہ اسے قصاصاً قتل کیا گیا ہے، تاریخی کتابوں میں لکھا ہے کہ: ''**اس نے اپنے ایک دیوان علی نقی کو قتل کر دیا تھا، اب جب کہ اورنگ زیب کے دور حکومت میں مذہبی احکام نافذ ہونے لگے تو علی نقی کے چھوٹے لڑکے نے اپنے باپ کے بدلے مراد کو قتل کرنے کی درخواست کی، اورنگ زیب نے اسے منع کیا، لیکن اس نے نہیں مانا، مجبوراً اسے گوالیار کے قاضی کے پاس بھیجا، قاضی نے بھی خوں بہا لینے پر بہت زور دیا، مگر اس لڑکے نے اسے بھی مسترد کر دیا، اب حکم صاف تھا کہ مراد سے قصاص لیا جائے، چنانچہ اسے قصاص میں قتل کر دیا گیا''۔(۷)**

کیا اس صریح واقعے کے بعد بھی اورنگ زیب عالمگیرؒ کی گردن پر اپنے بھائی کے ''قتل ناحق'' کا بے جا الزام رہے گا؟۔

☆ رہا معاملہ شجاع کے قتل کا، تو تاریخ ہمیں صاف بتاتی ہے کہ اس کا قاتل اورنگ زیب نہیں ہے؛ بلکہ اس کا قتل اس کی ناپاک سازش کے نتیجے میں برما میں ہوا، واقعہ یوں پیش آیا کہ جب کھجوا کے مقام پر اورنگ زیب اور شجاع کی فوجوں کا سامنا ہوا، اور شجاع کو شکست وریخت سے دوچار ہونا پڑا تو وہاں سے جان بچا کر برما کی طرف بھاگا، وہاں کے راجہ نے بڑی پذیرائی کی اور عزت واحترام سے خوب نوازا؛ لیکن جب راجہ کو یہ معلوم ہوا کہ یہ سازش کر کے ہمارے تخت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے تو اسے قتل کروا دیا۔(۸)

☆ جہاں تک مسئلہ ہے داراشکوہ کے قتل کا تو اس سلسلے میں دو ٹوک بات یہ ہے کہ اس کے قتل کی سیاسی وجوہات بھی تھیں اور شرعی بھی، اگر اسے قتل نہ کیا جاتا تو پھر ہندوستان میں اسلامی نقوش مٹ مٹا جاتے۔ یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب عالمگیرؒ کی بجائے اگر داراشکوہ ہندوستان کا بادشاہ بنتا تو وہ اس ملک میں دین کے لئے خطرہ بن جاتا، جیسا کہ اس کے عقائد و خیالات سے پتہ چلتا ہے، اورنگ زیبؒ اپنی تخت نشینی کا اعلان اسی لیے کرنا چاہتا تھا کہ ہندوستان میں اسلام کو بقا واستحکام حاصل رہے۔ علامہ شبلیؒ لکھتے ہیں:

''عالم گیر نے داراشکوہ کے مقابلے کا جب قصد کیا تو اس کا یہ سبب ظاہر کیا کہ داراشکوہ بدعقیدہ اور بددین ہے، اس لیے اگر وہ ہندوستان کا فرماں روا ہوا تو ملک میں بددینی پھیل جائے گی، عام مؤرخوں کا خیال ہے کہ یہ محض ایک فریب تھا، نہ داراشکوہ بے دین تھا اور نہ عالم گیر کی مخالفت کا یہ سبب تھا، دلوں کا حال خدا کو معلوم؛ لیکن اس کتاب (سراکبر) کے دیباچے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ داراشکوہ ہندو بن گیا تھا، اور کچھ شبہ نہیں کہ اگر وہ تخت شاہی پر متمکن ہوتا تو اسلامی شعار اور خصوصیات بالکل مٹ جاتے''۔(۹)

علامہ شبلیؒ کا تبصرہ یوں ہی نہیں ہے؛ بلکہ بڑا ہی حقیقت پسندانہ ہے، کیوں کہ داراشکوہ کے حالاتِ زندگی پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر اعتقادی اور عملی کفریات پوری طرح سرایت

کر چکے تھے ،وہ آزاد خیال تھااور مذہبی معاملات میں، عقائد میں تطبیق دینے والا صلح کل ،یعنی اکبری پالیسی کا پیروکار بھی تھا،وہ اکبر کا الحادی دور پھر سے لانا چاہ رہا تھا،یہی وجہ ہے کہ مذہب اور ثقافتوں کے حوالے سے داراشکوہ کا طرز عمل ہندواشرافیہ اور انتظامی اہل کاروں کے لیے جذباتی اپیل رکھتا تھا،وہ دارا کی شکل میں اکبر بادشاہ کا دوسرا جنم دیکھ رہے تھے کہ جس کی تخت نشینی سے بالآخر اسلام مقامی اثر پذیر ثقافت میں اپنا وجود کھو بیٹھے گا۔(۱۰) ایسے میں قانون شرع اور قانون سیاست کیا کہتا ہے؟ سچ فرمایا ہے مولانا فیصل احمد ندوی بھٹکلی نے:

''اس موقع پر جو بھی ہوتا، بشرطیکہ اس میں سیاسی شعور ہو، وہی کرتا جو اورنگ زیب نے کیا، حکومت کو انتشار سے بچانے کے لیے ایسے اقدامات ضروری ہوتے ہیں، پھر یہ کہ اس وقت شاہ جہاں اورنگ زیب کے سارے قصور معاف کر کے اس سے راضی ہو چکا تھا، اور اس کی تخت نشینی کا اعلان بھی ہو چکا تھا، اس کے بعد اس کے خلاف کسی کا خروج یا فوج کشی، کھلی بغاوت تھی، اور باغی کو دنیا نے ہمیشہ گردن زدنی ہی سمجھا ہے، اور اس کے لئے یہی سزا مقرر کی ہے، اس لحاظ سے اورنگ زیب نے جو کیا، بالکل صحیح کیا، ورنہ وہ ایک کمزور اور ناعاقبت اندیش حکمراں قرار پاتا''!(۱۱)

یہ جنگ تاریخ میں اگر چہ ''جنگِ تخت نشینی'' کے نام سے مشہور ہے؛ مگر سچی بات وہی ہے جو سید نجیب اشرف ندوی کی زبان قلم سے ٹپکی ہے کہ:

''یہ اورنگ زیب عالمگیر و دارا کی جنگ نہ تھی، یہ شجاع و شاہ جہاں کا تصادم نہ تھا، یہ مراد و عالمگیر کی مخالفت نہ تھی؛ بلکہ یہ کفر اور اسلام کی جنگ تھی، ایمان و الحاد کا تصادم تھا، اور صحیح شریعت و عامیانہ طریقت کی لڑائی تھی''۔(۱۲)

☆ اورنگ زیب عالم گیرؒ کے ''کردار'' پر باپ اور بھائیوں کے حوالے سے جو ''بدنما داغ'' لگائے گئے ہیں اس کی حقیقت جاننے کے بعد ان الزامات کا بھی جائزہ لینا ضروری ہے جو تنگ نظر اور متعصب مؤرخین نے اس پر ہندوؤں کے تعلقات کے حوالے سے لگائے ہیں۔

اور رنگ زیب عالمگیرؒ پر یوں تو الزامات واتہامات کی ایک طویل فہرست ہے؛ البتہ اختصار کے پیش نظر ان میں سے صرف چند کو ہم یہاں پیش کرتے ہیں، ہندوؤں کی طرف سے ترجمانی کرتے ہوئے جدوناتھ سرکار(۱۳) نے لکھا ہے:

۱۔ اس نے ہندوؤں کے علوم وفنون کو منتشر کیا۔
۲۔ ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو منہدم کیا۔
۳۔ ہندوؤں کے میلوں اور تہواروں کو روک دیا۔
۴۔ ہندوؤں پر مالی بار کا اضافہ کیا۔
۵۔ ان کو حکومتوں کی ملازمتوں سے محروم کر دیا۔(۱۴)

آگے چل کر لکھتا ہے:

''اورنگ زیب ایک کامیاب سپہ سالار، وزیر، مذہبی پیشوا، مکتب کا مدرس ہوسکتا تھا؛ لیکن قدرت کی ستم ظریفی نے اسے ایک تخت پر لاکر بٹھادیا، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی زندگی ناکام ہوکر رہ گئی، اور اس کی شہرت پامال ہوگئی''۔(۱۵) اتنا کچھ لکھ کر بھی اس کے قلب وقلم کو سکون نہ ملا تو اپنے ترکش سے آخری مگر زہر میں بجھا ہوا تیر نکال کر اس نے یوں وار کیا:

''وہ ایک درویش ہوسکتا تھا، گرچہ درویش کے اعلی صفات سے محروم تھا؛ لیکن وہ حکمراں کی حیثیت سے ایسا بدترین ثابت ہوا کہ اس سے زیادہ تصور نہیں کیا جاسکتا''۔(۱۶)

ان الزامات کی تردید اگر مسلم مؤرخین کی کتابوں سے کی جائے تو بہت ممکن ہے کہ جانبداری کا الزام عائد کر دیا جائے، اس لئے ان کی تردید کے لئے ایک غیر مسلم مؤرخ کی ہی تحریر پیش کی جارہی ہے، ''اکھلیش جائسوال'' ایک منصف غیر مسلم مؤرخ اور محتاط تجزیہ نگار کا نام ہے، ان الزامات کی سچائی کو پرکھتے ہوئے اور تاریخی شواہد ومعلومات کا تجزیہ کرتے ہوئے وہ صاف اور بے لاگ انداز میں لکھتا ہے:

''اورنگ زیب نے ہندوؤں کو نہ صرف اعلی عہدے دیے، اعلی منصب دیے؛ بلکہ انھیں مغلیہ سلطنت کا اعلی ترین گورنر کا عہدہ بھی عنایت کیا، جو زیادہ تر شہزادوں ہی کو ملتا تھا، یہی نہیں اورنگ زیب نے کئی ہندوؤں کو اعلی عہدہ دار بنایا، محکموں کا سربراہ بنایا، پورا محکمۂ

مالیات، محکمۂ تشریح، محکمۂ مالگذاری وغیرہ متعدد محکمے ہندو کارکنان سے بھرے پڑے تھے''۔(۱۷)

جدوناتھ سرکار نے اورنگ زیب عالمگیرؒ پر ایک الزام یہ لگایا ہے کہ اس نے ہندوؤں کے میلوں اور تہواروں پر پابندی لگادی تھی؛ لیکن یہ الزام بھی غلط اور انتہائی گمراہ کن ہے، اکھلیش جائسوال لکھتا ہے:

''سچائی یہ ہے کہ اس نے ہولی، دیوالی پر پابندی نہیں لگائی تھی ؛ بلکہ ان کے متعلق کچھ اصلاحی احکام جاری کیے تھے'' ۔(۱۸)

جدوناتھ سرکار کا سب سے بڑا اور بڑا الزام یہ ہے کہ عالمگیرؒ مندر شکن تھا، یہ صرف جدوناتھ سرکار ہی کا نہیں ؛ بلکہ بہت سے تاریخ نویسوں کا الزام ہے، اس الزام کی تردید کے لئے ہم ''قولِ فیصل'' کے طور پر اکھلیش جائسوال ہی کی ایک غیر جانب دارانہ تحریر پیش کرتے ہیں، وہ لکھتا ہے :

''جہاں تک مندر توڑنے کا سوال ہے، اس معاملہ میں تاریخ نویسوں نے صرف دو مندروں کے نام بتائے ہیں، جنھیں اورنگ زیب نے توڑا تھا، پہلا بنارس کا کاشی وشوانا تھ مندر، اور دوسرا کیشو رائے کا متھرا کا مندر، باقی کے نام معلوم نہیں، ایک متفقہ تعداد بھی کہیں نہیں ملتی کہ اورنگ زیب نے کتنے مندر تڑوائے، مشہور عالم علامہ شبلی نعمانیؒ کے مطابق اورنگ زیب نے ۱۴/ مندر توڑے، شاہ جہاں نے ۱۶، اور جہانگیر نے ۲۲۔۔۔اگر شبلی صاحب کا یہ بیان صحیح ہے تو ''مندر شکن'' کا خطاب جہانگیر کو دینا چاہیے؛ لیکن اسے کوئی کچھ نہیں کہتا، جب کہ اورنگ زیب، جس کے دور میں سب سے کم مندر توڑے گئے اور اسے ہی سب سے زیادہ بدنام کیا گیا، یہ اورنگ زیب کی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے''!۔

حقیقت کو واضح کرتے ہوئے مزید لکھتا ہے :

''اگر چہ یہ حقیقت ہے کہ اورنگ زیب کے وقت میں دو اہم مندر: ''کاشی کا وشوناتھ مندر اور کیشو رائے کا متھرا کا مندر'' توڑا گیا؛ لیکن اس بات کا کہیں واضح ثبوت نہیں ملتا کہ یہ دونوں مندر اس نے مذہبی عصبیت سے تڑوائے تھے، دراصل ان مندروں کے توڑنے کے پیچھے کچھ اور اہم وجوہات تھیں، جنھیں اندیکھا کر کے تاریخ نویسوں نے صرف اورنگ زیب کی انتہا پسندی کو ہی موردِ الزام ٹھہرایا ہے۔

☆ جہاں تک کاشی کے مشہور وشوناتھ جی کے مندر توڑنے کا معاملہ ہے، اس سلسلے میں حقیقت یہ ہے کہ ایک بار اورنگ زیب بنگال جاتے ہوئے جب بنارس کے پاس سے گزر رہا تھا، تو ہندو راجاؤں نے اورنگ زیب سے یہ گزارش کی کہ ایک دن یہیں قیام کرلیا جائے، تاکہ ان کی رانیاں بنارس جاکر گنگا میں غسل کرسکیں اور شیو کی پوجا بھی کرسکیں، اورنگ زیب نے فوراً ان کی درخواست قبول کرلی اور بنارس سے ۵/ میل دور فوج ٹھہرادی، ہندو راجاؤں کی رانیاں شاہی انتظام کے ساتھ پالکیوں میں روانہ ہوئیں اور گنگا میں غسل کیا، پھر رانیاں پالکیوں میں سوار ہوئیں اور وشوناتھ مندر میں پوجا کو گئیں، پوجا کے بعد تمام رانیاں تو واپس آگئیں ؛ لیکن ''کچھ '' کی مہارانی لاپتہ تھی، ہر طرف اس کی تلاشی ہوئی؛ لیکن وہ نہیں ملی، جب اورنگ زیب کو یہ خبر ہوئی تو اسے بہت غصہ آیا اور اس نے اپنے خصوصی جاسوس رانی کی تلاش کو بھیجے، ان جاسوسوں نے بڑی ہوشیاری سے اس کی تفتیش شروع کی، اس سلسلے میں جب یہ لوگ وشوناتھ جی کے مندر میں پہنچے تو دیکھا کہ وہاں گنیش جی کی ایک مورتی ہے جو بار بار اپنی جگہ سے ہل جاتی ہے، یہ مورتی جب اپنی جگہ سے ہٹائی گئی تو اس کے نیچے سیڑھیاں برآمد ہوئیں جو ایک تہ خانے تک جاتی تھیں، یہ تہ خانہ وشوناتھ جی کی مورتی کے ٹھیک نیچے تھا، اس تہ خانے میں جاسوسوں نے قدم رکھا تو انھوں نے رانی کو دیکھا جو رو رہی تھی اور اس کی عزت لوٹی گئی تھی، ساتھ ہی سارے زیورات بھی لوٹ لیے گئے تھے، اس واقعہ کے بعد تمام راجاؤں نے اورنگ زیب سے درخواست کی کہ مجرم کو سخت ترین سزا دے کر ان کے ساتھ انصاف کیا جائے، نتیجے کے طور پر اورنگ زیب نے فوراً یہ حکم دیا کہ وہ مقدس احاطہ جو ناپاک کردیا گیا ہے پھر پاک صاف کیا جائے، وشوناتھ جی کی مورتی کہیں اور لے جائی جائے اور مندر کو توڑ کر مہنت کو قید کرلیا جائے، اس لئے اس اقدام کے لئے ہم اورنگ زیب کو ہرگز موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے، مندر کے انہدام کے لئے وہ حالات ذمہ دار تھے جو اس وقت پیش آئے۔

☆جہاں تک متھرا کے کیشو رائے کے مندر کے توڑنے کا معاملہ ہے، یہ صحیح ہے کہ مندر توڑا گیا؛ لیکن وشوناتھ مندر کی طرح اس کے توڑنے کی بھی دوسری وجہ تھی، (دراصل) کیشو رائے کا مندر جاٹ باغیوں کا مرکزی مقام بن گیا تھا، وہ اس میں اسلحہ رکھتے تھے، یہیں اپنی خفیہ میٹنگ کرتے تھے، اور یہیں سے اپنی تمام سرگرمیوں کی تنظیم کرتے تھے، مغلیہ سلطنت کے دارالحکومت کے قریب اس قسم کی باغیانہ سرگرمیوں کا مرکز بننا اورنگ زیب کے لئے انتہائی تشویشناک امر تھا، اورنگ زیب کے بار بار منع کرنے پر بھی جب جاٹوں نے مندر کا استعمال بند نہیں کیا تو اورنگ زیب نے مجبور ہو کر فوجی کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا اور اس مند کے گروانے کا حکم دیا؛ لیکن اس نے یہ بھی حکم دیا کہ مندر کی مورتی اور پجاری کو کوئی نقصان نہ پہنچے، نتیجے کے طور پر مندر توڑا گیا اور مورتی کو باعزت طور پر بعد میں ''ناتھ دوارا'' (گجرات) میں نصب کر دیا گیا۔

مذکورہ واقعہ پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس واقعہ کا ذمہ دار اورنگ زیب ہرگز نہ تھا، کوئی بھی حکمراں ہوتا تو وہ بھی یہی قدم اٹھاتا جو اورنگ زیب نے اٹھایا، اگر اورنگ زیب متعصب مذہبی ہوتا تو مورتی توڑ ڈالتا اور پجاری کو بھی مار دیا گیا ہوتا؛ لیکن ایسا نہیں ہوا، حقیقت میں اس کی وجہ بھی سیاسی تھی جس کا ازالہ اورنگ زیب نے کیا''۔(۱۹)

سید نجیب اشرف ندوی کے بقول: ''اورنگ زیب کے مخالفین کا اس پر ایک بہت بڑا اتہام یہ بھی ہے کہ وہ ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنایا کرتا تھا، جب کہ اشاعتِ اسلام کے متعلق اورنگ زیب کا یہ اصول تھا کہ کسی شخص کو اس بات کا اختیار نہیں کہ وہ کسی شخص کی مجبوری ومعذوری سے فائدہ اٹھا کر یا اپنے درجہ یا مرتبہ کے اثر کا غلط استعمال کر کے کسی شخص کو تبدیلِ مذہب پر مجبور کرے، اور نہ اس کو پسند کرتا تھا کہ کوئی مجرم صرف سزا سے بچنے کے لئے اسلام کو قبول کرے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس کو بھی اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اگر کوئی شخص بہ رضا و رغبت مسلمان ہونا چاہے تو وہ اس کی پوری مدد اور اسکی تالیفِ قلب کے تمام ذرائع اختیار کرے۔

ایک اور بات جو اورنگ زیب کے تدبر پر دال ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس بات کو بھی پسند نہیں کرتا تھا کہ کوئی شخص کسی مذہب کے پیشوا کو برا کہے کہ فرقہ وارانہ منافرت کی یہی جڑ ہے، اور ایسے لوگوں کو جو سزا دی جاتی تھی اس کی وہ پرزور تائید کر کے اس برائی کا ابتدا ہی میں گلا گھونٹ کر خاتمہ کر دیتا تھا''۔(۲۰)

خلاصہ:

ان تفصیلات سے اچھی طرح واضح ہو گیا کہ الزامات واتہامات نے حقائق پر کس طرح پردہ ڈال رکھے ہیں، بدقسمتی سے اب تک ہندوستان کی تاریخ میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ فرقہ وارانہ رنگ سے خالی نہیں ہیں، اسکول وکالج میں بھی تاریخ کی جو کتابیں شامل نصاب ہیں وہ نسلی اور فرقہ وارانہ تعصب سے بھری ہوئی ہیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے آج سے تقریباً ۸۵/ سال پہلے جو بات لکھی تھی آج بھی وہ ایک حقیقت ہے، سید صاحب نے لکھا تھا:

''ہماری یونیورسٹیوں کی تاریخ ہند میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی باتیں جمع کی جاتی ہیں جن سے ہندو مسلمان کے جذبات میں اشتعال پیدا ہو، اور ان کا اتفاق آئندہ مشکل سے بڑھ کر محال ہو جائے، حالانکہ اس ملک کی تاریخ میں ایسے واقعات کی بھی کمی نہیں جن کے پڑھنے سے ان دونوں کے درمیان اختلاط ومحبت کے جذبات پیدا ہوں، مگر بازاری قدردانی کے تابع مصنف اور کتب فروش اپنی ذاتی عارضی کامیابی کے مقابلے میں ملکی اور قومی بھلائی کی قیمت کی پرواہ نہیں کرتے''۔(۲۱)

ہم اورنگ زیب عالم گیرؒ کو مجموعۂ محاسن نہیں کہتے، اسے بشری اور انسانی کمزوریوں سے پاک بھی نہیں سمجھتے؛ لیکن ہم اس کی اس تصویر کو بھی تسلیم نہیں کرتے جو متعصّبانہ قلم سے کھینچی گئی ہے، ہمارا موقف اس سلسلے میں وہی ہے جو ایک دیانت دار اور منصف مزاج مؤرخ (علامہ شبلیؒ) نے یوں بیان کیا ہے:

''عالم گیر کی جو تصویر اس کے مخالفوں نے کھینچی ہے، اس میں تو تمام تر تعصب اور عداوت کا رنگ بھرا گیا ہے؛ لیکن یہ کہنا بھی مبالغہ ہے کہ وہ انسانی کمزوریوں سے پاک تھا، باوجود ان تمام

خوبیوں کے جواس میں تھیں، ہم تیموری سلاطین کی فہرست میں وہی درجہ اس کو دے سکتے ہیں جو اسے ترتیب شمار کے لحاظ سے حاصل تھا، تاہم عام اسلامی دنیا میں اس کے بعد آج تک کوئی اس کے برابر کا شخص بھی نہیں پیدا ہوا''۔(۲۲)

حواشی وحوالہ جات :

(۱) (ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری :۳/۴۱، سید صباح الدین عبدالرحمٰن)

(۲) (اورنگ زیب کے ذاتی اوصاف وکمالات کے لیے دیکھیں :اورنگ زیب عالمگیر پرایک نظر، علامہ شبلی نعمانی، ص:۱۱۹-۱۲۴/ ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری :۳/۱۰۸-۱۰۹، سید صباح الدین عبدالرحمٰن)

(۳)(شاہی دربار میں اورنگ زیب کے خلاف کی جانے والی ریشہ دوانیوں کے لیے دیکھیے :اورنگ زیب عالمگیر پرایک نظر:۷۸-۹۱)

(۴) (اورنگ زیب کے سب سے بڑے دشمن ڈاکٹر برنیر کو بھی یہاں اورنگ زیب کے حق میں شہادت دینی پڑی، تفصیل کے لیے دیکھیں :اورنگ زیب عالمگیر پرایک نظر:۸۹)

(۵)(اورنگ زیب کس طرح شاہ جہاں کو قید میں بھی عیش وتنعم اور عزت وتوقیر سے نوازتا رہا، اس کے لیے دیکھیں: سیکولر لابی، تاریخ اور اورنگ زیب عالمگیر، از طارق جان:۲۱۸-۲۱۹)

(۶) (اورنگ زیب عالمگیر پرایک نظر: ۸۵-۸۶)

(۷) (سیکولر لابی، تاریخ اور اورنگ زیب عالمگیر، از طارق جان :۲۲۴-۲۲۶)

(۸) (تفصیل کے لیے دیکھئے: مقدمۂ رقعات عالمگیر:۴۷۹، سید نجیب اشرف ندوی)

(۹) (مقالات شبلی:۷/۹۸-۹۹)

(۱۰) (تفصیل کے لیے دیکھیں: سیکولر لابی، تاریخ اور اورنگ زیب عالمگیر، از طارق جان:۱۹۹-۲۰۱)

(۱۱)(اورنگ زیب عالمگیر، باپ اور بھائیوں کے معاملات، سیاست اور شریعت کی میزان میں:۵۲-۵۳، مولانا فیصل احمد ندوی)

(۱۲) (مقدمۂ رقعات عالمگیر:۳۳۴)

(۱۳) (جدوناتھ سرکار نے برطانوی حکومت کے اشارے پر اورنگ زیب کے خلاف پانچ ضخیم جلدوں میں ایک کتاب مرتب کی، جس نے ہندوؤں کے دلوں میں اورنگ زیب اور اسلام کی طرف سے نفرت پیدا کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ عام ہندو جواب تک اورنگ زیب اور اس کے مذہب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اس میں اس کتاب اور اس کے مصنف کا بڑا کردار ہے)

(۱۴)ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری :۳/۴۲-۴۳، بحوالہ: اورنگ زیب :۵/۴۸۵، جدوناتھ سرکار)

(۱۵)(ایضا:۴۳، بحوالہ: اسٹڈیز ان مغل انڈیا:۶۰-۶۲، جدوناتھ سرکار)

(۱۶) (ایضا)

(۱۷) (اورنگ زیب اور ہندوؤں کے ساتھ تعلقات : ۳۸، اکھلیش جائسوال)

(۱۸) (ایضاً:۱۸)

(۱۹) (ایضا:۳۲-۳۳)، یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ اورنگ زیب کی نگاہ میں مسجد ومندر دونوں برابر تھے، اور فیصلہ کرنے میں وہ دونوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتا تھا، اگر کسی مسجد کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ کوئی حکمراں اس کا غلط استعمال کررہا ہے تو اس نے اس کو بھی توڑنے کا حکم دیا ہے، گولکنڈہ کی جامع مسجد کی مسماری اس کے منصفانہ مزاج کی واضح مثال ہے، کہا جاتا ہے کہ گولکنڈہ کا حکمراں تاناشاہ اپنی ریاست کے محصول کو وصول کرتا؛ لیکن دہلی کچھ نہ بھیجتا، چند برسوں کے بعد کروڑوں کی رقم جمع ہوگئی، تاناشاہ نے اس کو زمین کے اندر دفن کردیا اور اوپر ایک جامع مسجد بنادی، اورنگ زیب کو اس کی خبر ہوئی تو اس نے مسجد کو مسمار کرادیا اور خزانے کو ضبط کرکے رفاہ عام میں صرف کردیا، (دیکھیے :ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری:۳/۳۱۶)

(۲۰) (مقدمۂ رقعات عالمگیر:۲۴۶-۲۴۷)

(۲۱) (ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری:۳/۳۲۳)

(۲۲) (اورنگ زیب عالم گیر پرایک نظر:۱۲۴)

☆☆☆

❑ تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

بچے سے اس لیے بات کیجئے تاکہ وہ آپ سے بات کرے: جو والدین بچوں کے سوالات کا بخوشی جواب دیتے ہیں اور ان سے گفتگو کرتے ہیں تو گویا وہ اپنے اس عمل سے بچے کو والدین کی ہر بات پر توجہ دینے اور جواب فراہم کرنے پر آمادہ کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ اگر بچے کو کھلا ماحول فراہم کریں گے اور اس کے سوالات کا اہتمام سے جواب دیں گے تو مستقبل میں آپ اس سے بھی سوالات کر سکیں گے، چنانچہ جو والدین اس کے شاکی رہتے ہیں کہ ان کے بچے انھیں اپنی زندگی کے بارے میں کچھ بتاتے نہیں ہیں، اگر آپ تحقیق کریں تو معلوم ہوگا کہ بچپن میں وہ بچے کے سوالات پر توجہ نہیں دیا کرتے تھے، اسی طرح اس کی زندگی اور اس کی بچپن کی مصروفیات کے متعلق شاید ہی اس سے کبھی گفتگو کیا کرتے تھے، جب بچہ چھوٹا تھا تو اپنے اس عمل سے والدین نے اس کو خود سے دور کر دیا، اب اس کے اس عمل پر ان کو تعجب کیسا؟

واقعہ یہ ہے کہ اگر بچپن میں آپ اس کے لیے کھلیں گے تو آئندہ عمر کے دیگر مراحل میں وہ آپ سے قریب ہوگا، اپنی باتیں آپ سے شیئر کرے گا، یہ الگ بات کہ اس کو اپنی بعض خاص چیزوں کو خفیہ رکھنے کا حق ہے، لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے مسائل آپ سے شیئر کرے اور آپ پر اعتماد کرے تو بچپن کے مرحلہ میں آپ دل کھول کر اس کے سوالات کا استقبال کیجئے، اس سے گفتگو کیجئے اور اس طرح اپنی محبت اور اپنا اعتماد اس کے دل میں بٹھا دیجئے۔

بچے کو زبان و کلام کی نشو ونما کے لئے آمادہ کیجئے: زبان کے استعمال کے اعتبار سے بچے کی زندگی کے ابتدائی سال بہت اہم ہوتے ہیں، اس زمانے میں مفردات کا اچھا ذخیرہ اور جملے بنانے کی مہارت، خطابت و کتابت اور انداز گفتگو نیز زبان کے استعمال کے لئے اچھی ابتدا سمجھی جاتی ہے، زبان کے استعمال کے باعث اس کے لیے اپنے افکار و خیالات کو الفاظ کا جامہ دینا ممکن ہوتا ہے، اس کے ذریعہ قوت تفکیر پروان چڑھانے میں بھی مدد ملتی ہے، یہی نہیں بلکہ زبان کا بہتر استعمال آنے سے دوسروں کو سننا اور سمجھنا بھی آسان ہوتا ہے، اگر بچے کو زبان کے استعمال پر قدرت نہ ہو، اس کے پاس الفاظ وکلمات کا خاطر خواہ ذخیرہ نہ ہو تو وہ بہت سے مواقع سے فائدہ نہیں اٹھا پاتا، اسکول میں اس کی ترقی (Progress) بہت سست ہوتی ہے، وہ اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر پاتا، دوسروں پر بہت محدود پیمانے پر اثر انداز ہو پاتا ہے، قدرت بیان پر گرفت کمزور ہونے سے وہ احساس کمتری کا شکار ہوتا ہے، لکھنے پڑھنے میں اس کی دلچسپی کم ہوتی ہے، ان تمام وجوہ واسباب کے پیش نظر اور بچے کی ترقی کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی زبان پر توجہ دینا اور زبان کے استعمال کو پروان چڑھانا بہت اہم عمل قرار پاتا ہے، جس پر بھرپور توجہ دینا انتہائی ضروری ہے۔

زبان کی نشو ونما کے کیے کچھ تدابیر:

۱۔ حتی المقدور اس کے ساتھ گفتگو کیجئے، اس کے سامنے

زبان کا استعمال کیجئے، اشیاء کی خصوصیات اور واقعات اس کے سامنے بیان کیجئے، مختلف امور کھول کر بیان کیجئے، اس کے سوالات کے جواب دیجئے، ان سب مراحل میں واضح اور سہل زبان کا استعمال کیجئے، ایسے الفاظ وکلمات کا انتخاب کیجئے جن کو بچہ بآسانی سمجھ سکے، کیوں کہ بچہ عام طور پر طویل اور پیچیدہ جملوں سے بہت جلدی اکتا جاتا ہے، اور ایسے افکار سے بھی بدکتا ہے جن کا احاطہ کرنا اس کے بس سے باہر ہو۔

۲۔ بچے کی گفتگو سنیے، جب وہ بولنا چاہے تو اسے اپنی بات جلدی کہنے پر مت مجبور کیجئے، اس کو یہ احساس نہ دلائیے کہ آپ اپنے کسی کام کے سبب بہت عجلت میں ہیں، اس لیے وہ اپنی بات جلد مکمل کرے، بلکہ صبر سے کام لیجئے، تاکہ بچے کو ایسا محسوس ہو کہ آپ اس کی طرف اچھی طرح متوجہ ہیں، جو وہ کہنا چاہتا ہے آپ اس کو سننے کے منتظر ہیں، نہ کہ وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ آپ سے بات کرنے کے لئے اسے جلدی بولنا پڑے گا، ورنہ آپ اعراض کریں گے اور اس کی جانب متوجہ نہیں ہوں گے۔

۳۔ جب بھی ممکن ہو اس کو کلمات کے استعمال پر آمادہ کیجئے، بہت سے بچے اشارے کے ذریعہ یا چیخ چلا کر اپنی مراد اور ضرورت کا اظہار کرنے میں ماہر ہوتے ہیں، ایسے بچوں کے تئیں ذمہ داری بڑھ جاتی ہے کہ وہ چاہیں نہ چاہیں مگر الفاظ کے ذریعہ مافی الضمیر کو ادا کرنے میں ان کی خاطر خواہ مدد کی جائے، البتہ یہ ملحوظ رہے کہ اس میں اتنا مبالغہ نہ ہو کہ بچہ، مایوسی اور احساس کمتری کا شکار ہو جائے، اس عمل میں آرام وخوش طبعی کا لحاظ رکھا جائے، اور بچے کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جائے کہ الفاظ وکلمات کس قدر سود مند و مفید ہوتے ہیں، بالخصوص کسی دقیق بات کو بیان کرنے اور دوسروں کو مخاطب کرنے کے لیے وہ کس قدر قیمتی ہوتے ہیں۔

۴۔ بچہ جب الفاظ کا استعمال کرے تو اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے، مگر اس قدر نہیں کہ وہ زبان کے استعمال کا ہدف محض آپ کی توجہ مبذول کرنے کو بنالے، اس لیے بس یہ کافی ہوگا کہ جب وہ صحیح زبان استعمال کرے یا الفاظ کا اچھا انتخاب کرے تو آپ اس کے سامنے مسکرا دیں یا یوں کہہ دیں ''یہ اچھا ہے'' ''یہ بہتر ہے'' وغیرہ۔

۵۔ بڑی نرمی کے ساتھ اس کی غلطیوں کی اصلاح کیجئے، مگر ایسا نہ ہو کہ جب بھی وہ بات کرنے کے لیے منہ کھولے تو آپ تصحیح کے لیے پیچھے پڑ جائیں، ایسا کرنے سے وہ بولنے اور بات کرنے کی کوشش پر خاموشی کو ترجیح دے گا اس لیے تصحیح بڑی نرمی اور چابکدستی سے اور کم سے کم ہونی ہئے، مثلاً اگر بچہ ایک ہی جملے میں کئی غلطیاں کر بیٹھے تو اس میں کسی ایک کی اصلاح کیجئے اور اس کے بدلہ میں صحیح تعبیر بتا دیجئے، یا یوں کہہ دیجئے، بھائی ہم عام طور پر اس لفظ کی جگہ یہ لفظ استعمال کرتے ہیں، ممکن ہے کہ وہ آپ کی تصحیح کے بعد بھی اپنی غلطی دوہرائے مگر آپ اصرار نہ کیجئے، وہ خود ہی جب دو تین مرتبہ سنے گا تو عادی ہو جائے گا اور صحیح استعمال کرنے لگے گا۔

۶۔ بچہ اگر جملہ مکمل کرتے کرتے رک جائے، یا کوئی لفظ نکالتے نکالتے رک جائے تو آپ جملہ مکمل کرنے میں یا اس لفظ کو بتانے میں جلدی نہ کیجئے، بلکہ انتظار کیجئے کہ وہ جملہ مکمل کر پاتا ہے یا نہیں، اس لفظ کو وہ خود یاد کر کے استعمال کر پاتا ہے یا نہیں، اگر آپ جانتے ہیں کہ وہ اس لفظ کو جانتا ہے تو محض کسی موقع سے اس کی تذکیر کیجئے، اس طرح آپ اس کی قوت تفکیر اور حافظہ کو استعمال کرنے میں بھی مدد کر سکیں گے۔

۷۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا: إقرأ وربك الأكرم (علق:۳)

چنانچہ آپ بچے کے سامنے کچھ پڑھئے، اس لیے کہ عبارت خوانی زبان وتکلم کے لیے نہ صرف مفید بلکہ اس پر ابھارنے کا کام کرتی ہے، جیسے جیسے آپ کے پڑھنے پر اس کی توجہ میں اضافہ ہوتا جائے گا، اور وہ اس سے فائدہ اٹھاتا جائے گا، اس کے پاس الفاظ کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا جائے گا، وہ نئے الفاظ اور ان کا استعمال

سیکھتا جائے گا اس کے نتیجے میں وہ زبان کے حسن اور اس کی کشش کا اس طور پر ادراک کرے گا کہ وہ باہمی گفت وشنید اور اظہار خیال کا مفید ترین وسیلہ ہے، اس لیے کتاب کھولنا اور اس میں سے بچے کے سامنے کچھ نہ کچھ پڑھنا بچے کی عمر کے اس ابتدائی مرحلے میں بھی مفید ہے، جبکہ وہ جو سنے اس میں سے کچھ بھی نہ سمجھے۔

۸۔ بچے کے لیے زبان کے استعمال، گفتگو اور قراءت کو لازم مت قرار دیجئے، بلاشبہ یہ ممکن ہے کہ اس سے بچہ جلدی زبان سیکھ جائے مگر اس ''جلدی'' کے بھی حدود ہیں، چنانچہ والدین کا کردار یہ ہے کہ وہ بچے کو زبان کی نشوونما کے مواقع فراہم کریں نہ کہ ایک استاد کی طرح اس کو سیکھنے پر مجبور کریں، اگر آپ اس پر پریشر بنائیں گے کہ وہ زبان جلد سیکھے تو ممکن ہے کہ وہ زبان کو دلچسپی سے خالی چیز تصور کرنے لگے، اور اس طرح جلدی سیکھنے کی ضد میں وہ زبان کے تعلق سے انتشار ذہنی کا شکار ہوجائے اور اس کے لیے زبان کا استعمال اور تکلم مزید مشکل ہوجائے۔

دیر میں بولنے والے بچے : بچوں میں تکلم اور زبان کی نشوونما کی رفتار بھی دیگر چیزوں کی طرح مختلف ہوتی ہے، چنانچہ اگر آپ کو یہ محسوس ہو کہ آپ کا بچہ بولنے میں دیر کر رہا ہے، دوسرے بچوں کی طرح اس کے اندر تکلم اور زبان کی نشوونما نہیں ہورہی ہے تو اس میں گھبرانے اور پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں ہے، تاریخ میں ایسے بہت سارے باکمال عظیم افراد گزرے ہیں جنہوں نے بچپن میں دیر سے بولنا شروع کیا مگر پھر اپنی زندگی میں بچپن کی اس کمی کی تلافی کردی۔

دیر سے بولنے کا ذہانت میں کمی سے کوئی حتمی تعلق نہیں، اسی طرح دیر سے بولنے کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ بچہ آئندہ کی اسکولی زندگی میں بھی اہداف کے حصول میں کمزور ہوگا، لیکن پھر بھی اگر آپ کو اپنے بچے میں اس طرح کے ضعف کا احساس ہو تو اپنے خاندانی طبیب (Family Doctor) سے مشورہ کیجئے، ممکن ہے وہ اس عنوان سے آپ کو بعض باتیں بتادے، اس لیے کہ اسکول جانے کی عمر سے قبل بچوں کی ان چیزوں کو جانچنے کا کوئی متعین پیمانہ نہیں ہے، البتہ طبیب بچوں کی زبان کی نشوونما کی فطری رفتار کے جدول سے آپ کے بچے کی رفتار کا موازنہ کرسکتا ہے۔ (وہ جدول اس فصل کے آخر میں دیا جائے گا)۔

مثلاً بچہ بعض وہ الفاظ جنھیں وہ سمجھتا ہے مگر ان کا تلفظ نہیں کر پاتا تو آپ ڈاکٹر سے مشورہ کیجئے، بالخصوص تب جبکہ آپ کو یہ احساس ہو کہ دیر سے بولنے کا سبب اس میں ضعف سماعت ہے، اس طرح کے حالات میں جس قدر جلد ہم امراض کی تشخیص کرنے میں کامیاب ہوں گے اسی قدر زیادہ اہم بچے کی نشوونما میں ان نقائص و امراض کے سلبی اثرات کو کم کرنے میں کامیاب ہوسکیں گے۔

اگر دیر سے بولنا عام تاخیر کا حصہ ہو، جیسے بچہ دیر میں بیٹھنے کی ابتدا کرے، اشخاص واشیاء کو دیر سے پہچاننا شروع کرے تو عام طور پر ڈاکٹر مختلف جانچوں کے ذریعہ اس تاخیر کا سبب معلوم کر لیتے ہیں اور پھر ممکن تدابیر سے آگاہ کردیتے ہیں۔

اگر بچے کو زبان سیکھنے میں کچھ تاخیر ہو تو گزشتہ سطروں میں ہم نے جن توجیہات وتدابیر کا ذکر کیا ان پر خاص توجہ دینا ضروری ہے، بالخصوص اس کو یہ احساس دلانا بہت ضروری ہے کہ اشخاص، اشیاء وضروریات کو بیان کرنے کے لیے زبان کی کتنی سخت ضرورت ہے، جو بچہ دیر سے بولے اس کی زبان کی نشوونما کے لیے بلاشبہ اسکولی زندگی سے پہلے بچوں کی نرسری کا ماحول زیادہ مفید ومؤثر ہے، جہاں بچہ دوسرے بچوں سے میل جول اور ان کو مخاطب کرنے کے لیے مجبور ہوتا ہے، اور جہاں بہت تیزی کے ساتھ زبان سیکھتا ہے، اگر آپ کے اردگرد بچوں کی نرسری نہ ہو تو پھر اس کا بدل یہ ہے کہ آپ اس کو دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے اور ملنے جلنے کا موقع فراہم کریں، بہرحال جو کچھ بھی ہو مگر ہر حال میں یہ کوشش کرنا چاہئے کہ بچہ زبان اور گفتگو میں پریشانی کا شکار نہ ہو کیونکہ یہ پریشانی اس کے

نمو میں مزید پریشانی کا سبب بنے گی۔

تکلم کی دیگر مشکلات:۔ بسا اوقات بچہ صحیح وقت پر بولنا شروع کرتا ہے لیکن وہ بعض دیگر مشکلات پاتا ہے ، مثلاً ''عصام'' کی جگہ ''مصام'' بول دیتا ہے ''نقاحۃ'' کی جگہ ''تحاقۃ'' کہتا ہے، بچوں کے یہاں اس قسم کے استعمالات عام بات ہے۔

اگر آپ دیکھیں کہ آپ کا بچہ بعض حروف مثلاً ''را'' نہیں نکال پاتا یا بعض کلمات کو نصف ہی ادا کر پاتا ہے ،تو اس سے بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام والدین کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کے بچے کو بولنے میں کوئی دشواری نہ ہو، یہ ایسے ہی ہے جیسے والدین بچے کی جسمانی بیماری کو دور کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں مگر مرض ہوتا ہے، اس لیے اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ، غالب گمان یہی ہے کہ بچہ جوں جوں بچپنے کے مرحلے سے آگے بڑھتا جائے گا اس کا تکلم وتلفظ صحیح ہوتا جائے گا۔

ہکلانا: (Stuttering) بعض مرتبہ ایسا بھی مشاہدہ ہوتا ہے کہ بچہ پوری کوشش کرتا ہے مگر لفظ اس کی زبان سے نہیں نکلتا ،لفظ کی ادائیگی سے پہلے وہ زبان سے کئی کئی مرتبہ آوازیں نکالتا ہے، عام طور پر بولنے میں اس تردد وتکرار کو ہکلانا کہا جاتا ہے ، بات کرنے میں پیش آنے والی دوسری پریشانیوں کی طرح ہکلاہٹ بھی لڑکیوں کی بنسبت لڑکوں میں زیادہ پائی جاتی ہے۔

ہکلاہٹ عام طور پر جسمانی اسباب سے زیادہ نفسیاتی وجوہات کی بنا پر پیدا ہوتی ہے، اسی لیے یہ ولادت کے وقت سے نہیں پائی جاتی ، بلکہ نشو ونما اور فطری طور پر جسمانی ترقی کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے ، جیسے جیسے بچے کی زندگی پر نفسیاتی عوامل اثر انداز ہونا شروع ہوتے ہیں ویسے ویسے یکبارگی ہکلاہٹ کا ظہور ہونے لگتا ہے۔

آپ کے خیال میں اس کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں؟

عام طور پر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جو لوگ بچے کے آس پاس ہیں ان کے اور بچے کے مابین تعلقات میں خطا ہو رہی ہوتی ہے، جب وہ دوسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں پریشانی محسوس کرتا ہے اور پھر اس کو گفتگو میں بھی پریشانی ہوتی ہے، یا اس میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کو جلد ہی بولنا چاہیے، کیوں کہ لوگ ہمیشہ جلدی میں رہتے ہیں اس لئے اگر وہ جلدی جلدی نہیں بولے گا تو لوگ اس کی بات پر توجہ دیے بغیر چلے جائیں، کیوں کہ ان لوگوں کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ٹھہر کر اس کی بات کو پورے اطمینان کے ساتھ سنیں، پھر جب ہکلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے تو بچہ اس سے نجات حاصل کرنے میں کافی دقت محسوس کرتا ہے اور اس احساس کے سبب اس کے لیے گفتگو اور زیادہ مشکل ہو جاتی ہے، اور کسی کو وہ اپنے طرز گفتگو پر ہنستا دیکھ لے تو پھر اس کی مشکل مزید بڑھ جاتی ہے اور معاملہ بہت خراب ہو جاتا ہے، پھر فطری طور پر وہ لوگوں سے بات کرنے کی قدرت کھو بیٹھتا ہے اور اپنے آپ پر سے اس کا اعتماد اٹھ جاتا ہے۔

کبھی کبھی ہکلاہٹ کسی شدید نفسیاتی دباؤ کے سبب پیدا ہو جاتی ہے، جیسے بچوں کو سخت حالات یا جنگ وغیرہ کے ماحول کا سامنا کرنا پڑے، لیکن زیادہ تر ہکلاہٹ کا جو سبب بنتا ہے وہ یہ کہ جب بھی والدین میں سے کوئی غصہ ہوتا ہے تو وہ بچے کے کسی عمل پر اس سے سخت غصہ میں بات کرتا ہے، حتی کہ اس کو سکون کے ساتھ اپنا دفاع کرنے کا بھی موقع نہیں دیتا، جب کہ بچہ اپنی برأت کے اظہار کے لیے کوشاں ہوتا ہے اور وہ اپنا اعتذار پیش کرنا چاہتا ہے، اسی طرح اگر والدین بچے پر جلدی جلدی بولنے کا پریشر ڈالتے ہیں تو بھی بچے میں ہکلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

چنانچہ جب بچہ ہکلانے لگے تو والدین کو جائزہ لینا چاہئے کہ کیا بچے پر سختی کی گئی ہے، خواہ سختی گفتگو سے متعلق ہو یا کسی اور طریقے کی سختی ہو، جو واقعات پیش آئے ہوں ان کا جائزہ لینا چاہئے ، دیکھنا چاہئے کیا بچہ بعض کاموں کی انجام دہی میں پریشانی محسوس کرتا ہے؟ کیا وہ اپنی جانب لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے جلدی گفتگو کرتا ہے؟

اگران چیزوں میں سے کوئی بھی بات مثبت ہوتو والدین کو چاہئے کہ فوراًاس امر میں سختی کم کریں اور تخفیف کو اپنائیں۔

بسا اوقات والدین بچوں سے بڑی اعلی توقعات لگائے رہتے ہیں، جس کے سبب بچوں پر ہمیشہ اپنے والدین کے حسن ظن پر کھرا اترنے کا پریشر رہتا ہے، اسی طرح کبھی کبھی والدین داخلی یا خارجی مسائل کے سبب ذہنی تناؤ کا شکار ہوتے ہیں، جس کے سبب ان میں چڑچڑا پن، جذباتیت اور غصے کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اس کے اثرات پھر بچے کی تربیت میں ان کے کردار پر پڑتے ہیں، حالانکہ ایسے مواقع پر ان کو صبر سے کام لینا چاہئے، بچے کے ساتھ رعایت کرنی چاہئے، اسے وقت دینا چاہئے، اپنی محبت کا اس کو احساس دلانا چاہئے، اسے امن وسکون کا بھی احساس دلانا چاہئے، گفتگو میں ہکلانے پر اس سے ہرگز جلدی کا مطالبہ نہ کیا جائے بلکہ اس سے کہا جائے کہ جلدی نہ کرے، جتنا وقت درکار ہو اتنا وقت لے کر اطمینان سے بات کرے، اس اہتمام وتوجہ سے اس کی بات سنی جائے گویا وہ بغیر کسی مشکل کے طبعی انداز (Normaly) میں گفتگو کر رہا ہے۔

کبھی بچے کو یہ نہیں باور کرانا چاہئے کہ آپ اس کے انداز گفتگو سے پریشان ہوتے ہیں اور لوگوں کے سامنے شرمندہ ہوتے ہیں، اسی طرح ہکلانے کے سبب اس کے ادھورے کلمات کو مکمل نہیں کرنا چاہئے، اس طریقے سے آپ اس کی کوئی مدد نہیں کرسکیں گے، بلکہ آپ یہ کیجئے کہ بچے کو احساس دلائیے کہ وہ آپ کی زندگی کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس لیے جتنا وقت چاہے اتنا وقت لے سکتا ہے۔

ہکلانے والے بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ان سے کبھی کبھی سرگوشی کے انداز میں گفتگو کی جائے ورنہ کم از کم ان سے گفتگو انتہائی نرم لہجہ اور دھیمی آواز میں کی جائے، اس لیے کہ بہت سے بچے محض اسی وقت ہکلاتے ہیں جب ان سے اونچی آواز میں بات کی جائے، اس لیے کہ یہاں پریشانی منہ سے کلمہ کی ادائیگی میں نہیں ہوتی بلکہ کلمہ کو صحیح طریقے سے ادا کرنے کی قدرت میں نقص ہوتا ہے، اس لیے بسا اوقات بچے کے ساتھ ایسا کھیل کھیلنا چاہئے جس میں ہر شریک دوسرے کے کان میں دھیرے سے کچھ کہتا ہے، چنانچہ جب بچہ دیکھے گا کہ وہ سرگوشی کے انداز میں گفتگو پر بھی قادر ہے تو اس سے اس کی خود اعتمادی اور اپنے اندر موجود صلاحیت میں اضافہ ہوگا، پھر وہ رفتہ رفتہ صحیح انداز میں گفتگو کرنے لگے گا۔

اس سلسلے میں غزل، نظم اور گیت وغیرہ گنگنانا بھی مفید ہوتا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ بہت سے ہکلانے والے بچے جب نعت وغیرہ پڑھتے ہیں تو بالکل نہیں ہکلاتے، اس لیے قرآن کو مترنم لہجہ میں پڑھنا، شعر گنگنانا بالخصوص اجتماعی طور پر نظم وغیرہ پڑھنا بہت مفید ہے۔

ہکلانے والے بچوں کے سلسلہ میں ایک بات کا خاص خیال رکھنا چاہئے کہ آپ ان کی اس کمزوری کا کبھی بھی مذاق نہ اڑائیں اور نہ ہی کسی کو اس کی اجازت دیں کہ ان کے طرز کلام کا مذاق اڑائے، اگر بھائی بہنوں میں سے کوئی اس کو چڑھائے اور اس کا مذاق بنا کر اس کو غصہ دلائے جیسا عموماً ہوتا ہے، تو اس بچے کو تنہائی میں سمجھانا چاہئے کہ صحیح طریقے پر گفتگو ہزار نعمت ہے، ہر انسان کو صحیح طریقے سے بولنا چاہئے، اگر یہ نعمت ہم کو حاصل ہے تو ہمیں اس کی مدد کے لیے آگے آنا چاہئے جس کو بولنے میں کسی قسم کی دشواری کا سامنا ہے، بچوں کو یہ بھی سکھانا چاہئے کہ کسی کا مذاق بنانا اور اس کے ذریعہ ان کو غصہ دلانا انتہائی تکلیف دہ اور نقصان دہ عمل ہے۔

نرمی، افہام وتفہیم اور صبر کے ذریعہ اکثر بچوں کا انداز گفتگو درست ہوجاتا ہے، لیکن پھر بھی اگر ہکلانے کی پریشانی مسلسل باقی رہے تو پھر فیملی ڈاکٹر سے یا ماہر نفسیات (Psychologist) سے مشورہ کرنا چاہئے، پھر لوگ اس کو ماہر کلام Speech therapist کو ریفر کردیں گے۔

☆☆☆

❑ لمحۂ فکریہ

اگر اب بھی نہ جاگے تو.....

(نئی نسل میں ارتداد کا طوفان)

مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی

ہوش اڑادینے والے واقعات :۔ (۱)۔ اسی رمضان المبارک سے قبل شعبان میں کوکن میں جامعہ حسینیہ سری وردھن کے سالانہ جلسہ سے واپس ہوتے ہوئے ایک جگہ ساحلی خطہ میں طالبات کے تقسیم انعامات کے پروگرام میں حاضری کے دوران ہمارے دوست مولوی عبدالمطلب صاحب مروڑ جنجیرہ نے یہ ہوش اڑادینے والی خبر صاعقہ اثر سنائی کہ چند ماہ قبل قریب کی بستی میں دو مسلم طالبات نے اسلام کو خیر باد کہہ کر ارتداد کی ظلمتوں میں قدم رکھا، دل دہلا دینے والی اور نیند اڑادینے والی یہ خبر کیا کم تھی کہ گھر واپسی پر اخبارات کے ذریعہ معلوم ہوا کہ ہمارے قریبی ضلع میں ایک مسلم طالب علم بھی اسلام جیسی عظیم نعمت کو ٹھکرا کر مرتد ہوگیا۔

(۲)۔ گذشتہ سال نومبر میں پورے ملک میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے ملک گیر سطح پر طلاق اور آئینی قوانین کے حق میں دستخطی مہم چلائی گئی، اس کے الحمدللہ دیرپا اور مثبت نتائج سامنے آئے، ملت کی صاحب بصیرت دینی قیادت بالخصوص حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی دامت برکاتہم اور حضرت مولانا ولی رحمانی صاحب مدظلہ العالی کی سرپرستی میں چلنے والی اس مہم نے ہمارے مسلم معاشرہ میں دینی بیداری میں اہم رول ادا کیا اور سائرہ بانو کے طلاق کے خلاف پچاس ہزار مسلم خواتین کے دستخطوں کے دعوے کے مقابلہ میں چار کروڑ سے زائد حقیقی دستخطی دستاویزات بورڈ کے دہلی آفس میں جمع ہوئے، لیکن دوسری طرف اس مہم کے دوران مسلم معاشرہ کے بعض منفی پہلو بھی سامنے آئے، مثلاً اندازہ ہوا کہ پچاس ہزار نہ سہی دو چار ہزار مسلم خواتین اب بھی ہمارے درمیان ایسی موجود ہیں جن کے دلوں میں اسلام کے ان فطری اور عقلی قوانین کے متعلق شکوک وشبہات پائے جاتے ہیں، ہمارے محترم دوست مولانا شبیر صاحب ندوی بنگلوری نے انھی دنوں یہ ہوش ربا خبر سنائی کہ دعوتی میدان میں نمایاں خدمت انجام دینے والے ایک صاحب کی اہلیہ حسنِ اتفاق سے جو تعلیم یافتہ اور دعوتی کاموں میں ان کی دست راست بھی ہے اس نے بورڈ کی طرف سے پیش کیے گئے دستخطی کاغذات پر دستخط کرنے سے یہ کہہ کر صاف انکار کردیا کہ مجھے اسلام میں مردوں کو دیے گئے طلاق کے حق کے متعلق اطمینان نہیں اور میرا دل اس سلسلہ میں مطمئن نہیں۔

(۳)۔ دو سال پہلے کی بات ہے، جامعہ میں ہمارے استاذ محترم مولانا ناصر صاحب اکرمی نے مجھے ایک مسلم تعلیم یافتہ خاتون کا جس کا دیندار گھرانہ سے تعلق ہے ایک ایسا مضمون دکھایا جس میں اس نے صاف لکھا تھا کہ خواتین کو بلوغ کے بعد بھی پردہ کے سلسلہ میں جبر واکراہ سے کام نہیں لینا چاہیے، یہ ان کی فطری آزادی میں دخل دینے کے مترادف ہے اور کچھ ہی دنوں کے بعد اس نے ایک اخباری بیان بھی جاری کیا کہ مردوں کے لیے طلاق کے حق کے سلسلہ میں علماء کو دوبارہ غور کرنا چاہیے۔

ان واقعات کے محرکات :۔ آپ ان تینوں واقعات کا دعوتی تجزیہ کیجیے تو ان سب کا الگ الگ محرّک وسبب سامنے آئے گا، پہلے واقعہ میں ان طالبات کے دلوں میں اسلام جیسی عظیم نعمت کی اہمیت اور شرک وکفر کی غلاظتوں وقباحتوں کا عدم احساس، دوسرے واقعہ میں اسلام کے ظاہری مظاہر سے آراستہ

ہونے اور دعوتی میدان میں اپنی خدمات کے باوجود اسلامی قوانین کی برتری پر اس مسلم خاتون کا عدم اطمینان، تیسرے واقعہ میں اسلامی دانشوری اور روشن خیالی کے پردہ میں مسلم خاتون کی طرف سے اسلام کی غلط ترجمانی، ان سب نتائج کو اگر صرف ایک مختصر جملہ میں ادا کیا جاسکتا ہے تو اس کو ہم نئی نسل میں اسلام کے تئیں اعتماد کی بڑھتی کمی سے تعبیر کر سکتے ہیں جو بقول مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ امت کا اس وقت کا سب سے اہم ترین اور توجہ طلب مسئلہ ہے، گذشتہ سو سالوں میں امت کے اس فکری المیہ اور تہذیبی ارتداد کی حساسیت کا سب سے زیادہ احساس پورے عالم اسلام میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ہی کو تھا، آپ کی پوری زندگی اخیر تک ذہنی ارتداد کی اسی سنگینی کے تعلق سے امت کو بیدار کرنے میں گذری، آپ کی اسی فکرمندی اور ملت کے لیے آپ کی اسی تڑپ وکڑھن نے آپ کو مفکر اسلام کے خطاب سے موسوم کیا تھا۔

افسوس کہ نہ صرف عالمی سطح پر بلکہ ملکی سطح پر بھی ہماری امت اور خود اس کی دینی قیادت کی اکثریت بھی اس المیہ کی نزاکت کو سمجھ کر اس پر توجہ دینے سے غفلت برت رہی ہے اور اس کے نتیجے تیزی سے سامنے آرہے ہیں اور ہر دن ہماری نئی نسل میں اسلام پر اعتماد کی کمی کے ہوش ربا واقعات ہمارے سامنے آرہے ہیں، ملت کے تعلیمی، سماجی، اصلاحی اور دیگر مسائل پر مشرق سے مغرب تک بیٹھکیں ہورہی ہیں مشورے اور سمینار منعقد ہورہے ہیں، لیکن اس اہم ترین اور نازک ترین المیہ پر فکرمندی کے ساتھ عالمی یا ملکی سطح پر کوئی سنجیدہ بیٹھک نہ ہونے کے برابر ہے، مسئلہ اتنا سنگین ہے کہ کچھ دنوں تک امت کے تمام مسائل کو کنارے رکھ دیا جائے اور صرف اس مسئلہ پر پوری امت سر جوڑ کر بیٹھے، تب بھی فوری اس کا حل آسان نہیں، جو ذہنی ارتداد اور فکری الحاد سامنے آرہا ہے وہ درحقیقت ہمارے معاشرہ میں موجود ارتداد والحاد کے واقعات کے دس فیصد مظاہر بھی نہیں ہیں، ورنہ ۹۰/ فیصد واقعات وحقائق پر اللہ تعالی نے اب بھی اپنے کرم سے پردہ ڈال رکھا ہے، سچی بات یہ ہے کہ ہماری بداعمالیوں کی وجہ سے خدانخواستہ کسی دن اگر اللہ تعالی اس کا پردہ فاش فرمادیں گے تو خود اپنے گاؤں اور خاندانوں میں اس بھیانک کردار کے حامل افراد کے متعلق جان کر اور سن کر ہمارے ہاتھوں کے طوطے اڑ جائیں گے، پیروں تلے زمین کھسک جائے گی، ہم خون کے آنسو رونے پر مجبور ہو جائیں گے اور گھر واپسی ہم کو آگرہ اور مظفر نگر کے بجائے خود اپنے آس پاس نظر آئے گی۔

آخر ایسا کیوں ہورہا ہے :- ظاہری دینی مظاہر میں اضافہ اور اخلاقی ترقی کے باوجود اندرون میں نئی نسل میں اسلام پر روز کم ہوتی اعتماد کی اس کمی کے مختلف اسباب ومحرکات ہیں، اس کا بنیادی سبب بچپن سے اپنی اولاد کو بنیادی دینی تعلیم سے آراستہ کرنے میں والدین وسرپرستوں کی کوتاہی ہے، اسی کے ساتھ برِ صغیر میں مغرب سے درآمد نئے نظام ونصابِ تعلیم اور موجودہ سوشل میڈیا کے عمل دخل نے ان کو اسلام سے عملی ہی نہیں بلکہ فکری طور پر دور کرنے میں جلتی پر تیل کا کام کیا ہے۔

اس وقت ہماری امت کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ مسلم معاشرہ میں اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کرنے کے جنون اور اس کے لیے معیاری اسکولوں اور کالجس کے انتخاب نے سرپرستوں میں ایمان وشرک، حلال وحرام اور جائز وناجائز کے فرق کو مٹادیا ہے، نصابی ضروریات اور ثقافتی پروگراموں کے نام سے اپنی اولاد کو ایمان سوز حرکتوں سے روکنے پر بھی ان کا کمزور ایمان آج کامیاب نہیں ہورہا ہے، مخلوط تعلیم سے کل تک حیاسوز واقعات سامنے آرہے تھے، افسوس اب ایمان سوز واقعات کا ہمیں سامنا کرنا پڑ رہا ہے، کل تک کالجس اور یونیورسٹیوں میں محبت کی شادیوں کے واقعات نے ۹۰ فیصد غیر مسلم طلباء کو اسلام لانے پر مجبور کردیا تھا، لیکن اب ہم روز اس کا مشاہدہ کررہے ہیں کہ اب دو تہائی ہمارے بچے اور بچیاں صرف ان ہی شادیوں کی خاطر اپنے ایمان واسلام کو چھوڑنے میں بھی عار محسوس نہیں کررہے ہیں اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ خود ان کے والدین بھی اس شرک عظیم کی ان قباحتوں کو سمجھنے سے عاجز وغافل ہیں، تجدد وروشن خیالی اور نام نہاد دانشوری دینی تعلیم سے اپنے بچوں کو آراستہ کرنے میں رکاوٹ بن

رہی ہے اور اس کو والدین اپنی اولاد کے مفروضہ روشن وتابناک مستقبل کے لیے عار سمجھ رہے ہیں، دینی مدارس کا ان کے نونہالوں کا رخ کرنا تو دور کی بات خود ہمارے مسلم تعلیمی اداروں کے بعض ذمہ داران بھی اسلامی ماحول میں عصری تعلیم کے نظم میں ہچکچاہٹ محسوس کررہے ہیں، اس خوف سے کہ کہیں ان پر شدت پسندی اور بنیاد پرستی کا لیبل نہ لگے، ہمارے بعض تعلیمی مراکز میں بھی وہ سب غیر اسلامی اور غیر ایمانی حرکات وثقافتی سرگرمیاں انجام پارہی ہیں جن کے ارتکاب سے شریف غیر مسلم ذمہ دارانِ اسکولس وکالجس بھی اس گئے گذرے دور میں باز رہتے ہیں۔

اس کے تدارک کے لیے ہمیں کیا کرنا ہے :۔ اس نازک مسئلہ اور ہوش اڑا دینے والے المیہ کا یقینی حل تو یہ ہے کہ امت کے ہر گھر بلکہ ہر باپ کی اولاد میں ایک عالم دین ضرور ہو جو اپنے بھائی بہنوں اور گھر والوں کو ان میں سرایت کرتی غیر محسوس گمراہی سے روک سکے، حلال وحرام کی نشاندہی کرسکے، دین کے معاملات میں ان کی رہبری کرسکے اور اپنے پورے گھرانے اور خاندان کو ایمان وتوحید پر باقی رکھنے کی فکر کرسکے، لیکن خود ہمارے ملک اور برصغیر میں بھی عملاً ایسا نہیں ہے، ہر خاندان میں ایک عالم سے اب بھی ۹۰ فیصد خاندان خالی ہیں اور بظاہر مستقبل میں شاید اس کا امکان بھی نہیں ہے۔

آج بھی جب کہ عالمی سطح پر دینی واسلامی بیداری کی لہر کا ہر جگہ چرچا ہے کچھ علاقوں کو مستثنیٰ کرکے ہمارے دینی مدارس کے طلبا وطالبات میں خوش حال گھرانوں کی نمائندگی بہت ہی کم ہے محل نما گھروں میں رہنے والوں، کروڑوں کے قیمت والے فلیٹوں میں زندگی بسر کرنے والوں، شام کو پارکوں اور مالس میں سیر سپاٹا کرنے والوں، دوستوں اور سہیلیوں کے ساتھ رات کو دیر تک باہر رہنے والوں اور ریستورانوں میں رات کا کھانا (ڈِنر) کھانے کی عادت والوں کے لیے ہمارے مدارس کا دینی ضابطہ کا ماحول راست نہیں آسکتا اور آئندہ بھی ان سے دینی مدارس کا رخ کرنے کی امید نہیں کی جاسکتی، ایک طرف گاؤں اور شہروں کا یہ حال ہے تو دوسری طرف اپنے گھروں سے دور بڑے بڑے شہروں میں تعلیم کے لیے قیام پذیر ہمارے نونہالان ڈگریوں کے حصول کے معاً بعد اچھی کمپنیوں سے منسلک ہوجاتے ہیں، پھر وہاں کا مخلوط ماحول ان کی رہی سہی اخلاقی حالت کی کسر کو بھی پورا کردیتا ہے۔

اب آپ ہی بتائیے کہ ہماری ان نوخیز نسلوں کو اخلاق سوز وایمان سوز حرکتوں سے باز رکھنے کی خاطر بنیادی دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے کہاں موقع رہ جاتا ہے، لیکن ان سب کے باوجود ہم مایوس نہیں، اسلام میں ناامیدی ومایوسی کفر ہے، اللہ پاک کی کمال قدرت کا یہ عالم ہے کہ وہ سیکنڈوں سے بھی کم وقت میں دلوں کے حالات تبدیل کردیتے ہیں، ان گھٹاٹوپ اندھیروں میں بھی الحمدللہ ہمیں امید کی کرن نظر آرہی ہے، ابھی پانی سر سے اونچا نہیں ہوا ہے، اب بھی اس سیلاب پر بند باندھا جاسکتا ہے اور اس کو روکنے میں اللہ کی مدد سے کامیابی حاصل ہوسکتی ہے، بشرطیکہ اس مسئلہ کی نزاکت کا ہمیں اندازہ ہو اور ہم صرف خیالی جزیروں میں پناہ لے کر یا ساحل کے خاموش تماشائی بن کر نہ بیٹھ جائیں۔

(۱)۔ سب سے پہلے والدین اور سرپرستوں میں اس حسّاس مسئلہ اور ایمانی المیہ کے تئیں بیداری پیدا کی جائے کہ غیر محسوس طریقہ پر ہماری نئی نسل کس طرح اسلام سے دور ہوکر شرک وکفر کی دلدل میں پھنستی جارہی ہے، جمعہ کے خطبات اور جلسوں سے زیادہ اب سوشل میڈیا سے بھی ہمیں اس سلسلے میں فائدہ اٹھانا چاہیے، اس طرح کے ہوش ربا واقعات کی چھوٹی چھوٹی کلپ بنا کر واٹس ایپ میں عام کی جائے اور اس پر مختصر تجزیاتی دعوتی گفتگو کے ذریعہ مثبت انداز میں حکمت کے ساتھ اس کو روکنے کی ممکنہ عملی کوششوں سے والدین وسرپرستوں کو آگاہ کیا جائے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے الفاظ میں ان کو بتایا جائے کہ ”شرک وکفر صرف مندروں میں جاکر گھنٹی بجانے اور بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا نام نہیں بلکہ نماز روزوں کے ساتھ اسلام کے ابدی قوانین پر ہلکے سے شک وشبہ سے بھی صاحب ایمان ایمان سے نکل کر شرک میں مبتلا ہوجاتا ہے“۔

(۲)۔ آن لائن دینی تعلیم کے جو کامیاب نظام سوشل میڈیا کے

ذریعے چل رہے ہیں گھر بیٹھے ان سے اپنے بچوں کو منسلک کریں تاکہ روزانہ آدھ یا پون گھنٹہ ہی سہی وہ گھر بیٹھے قرآنی و دینی تعلیم حاصل کریں، اس سلسلہ میں ہمارے فارغین جامعہ کی طرف سے لرن قرآن (Learn Quran) کے نام سے جاری کردہ آن لائن نظام سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

(۳)۔ بابری مسجد کی شہادت کے بعد ہمارے ملک میں مسلمانوں میں تعلیمی بیداری میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے، تقریباً ہر شہر میں مسلمان اپنے تعلیمی اداروں کے قیام میں خود کفیل ہوگئے ہیں اور اچھے معیاری مسلم اسکولس بنیادی دینی تعلیم کے ساتھ قائم ہوگئے ہیں، والدین طے کریں کہ کم ازکم بارہویں تک ہر حال میں مجھے میری اولاد کو مسلم اور ملّی اسکولوں ہی میں پڑھانا ہے، چاہے اس کے لیے ایمان واخلاق کی بقا کی فکر میں کچھ قربانی دینی پڑے۔

(۴)۔ ہمارا کوئی مسلم محلّہ جز وقتی مکاتب سے خالی نہ ہو، گاؤں اور شہروں میں قائم شبینہ وصباحی مکاتب میں صرف ناظرہ قرآن پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ ہفتہ میں کم ازکم دو تین دن ایمانیات اور فقہ اسلامی وسیرت نبوی کے اسباق کا بھی نظم کیا جائے اور طلبا کی نفسیات وضروریات کے مطابق ملک بھر میں اس سلسلہ میں جو نصابی کتابیں اسلامیات ودینیات کی تیار ہوئی ہیں ان سے مدد لی جائے۔ (اس سلسلہ میں فارغین جامعہ کے ذریعہ مولانا ابوالحسن علی ندوی اسلامک اکیڈمی بھٹکل نے بھی نرسری سے لے کر کالج تک کے طلبا کے لیے پندرہ جلدوں میں اسلامیات کے نام سے ایک جامع نصاب مرتب کیا ہے جو دس دینی مضامین پر مشتمل ہے اور گذشتہ پندرہ سالوں سے الحمدللہ ملک وبیرون ملک کے تین ہزار سے زائد اسکولوں وکالجس میں داخل نصاب ہے، یہ نصاب عربی، اردو، انگریزی ہندی، فارسی، پشتو، آسامی، نیپالی، تامل، بنگالی اور کنڑ زبانوں میں دستیاب ہے، اس سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔)

(۵)۔ مسلم اسکولوں کے ذمہ داران بھی کم ازکم روزانہ ایک گھنٹہ اپنے تعلیمی اداروں میں ناظرہ قرآن کے علاوہ عقائد، سیرت اور فقہ وغیرہ کے لیے خاص رکھیں، چاہے اس کے لیے اپنے موجودہ نظام تعلیم کے اوقات میں شروع یا اخیر میں ایک آدھ گھنٹے کا اضافہ کرنا پڑے، جیسا کہ کیرلا اور گجرات کے اکثر مسلم اسکولوں میں اس پر توجہ دی گئی ہے۔

(۶)۔ مسلم کالجس اور ہائی اسکولوں میں ہفتہ میں کم ازکم ایک گھنٹہ کے لیے جمعرات یا سنیچر کو علماء کے محاضرات رکھے جائیں جس میں اسلام وایمان کی جزئیات اور عقائد کی باریکیوں اور حلال وحرام کی تفصیلات کے ساتھ اسلام کی برتری اور اس کے قوانین کے منطقی وعقلی ہونے پر طلبا سے خطاب کیا جائے۔

(۷)۔ جو طلبا اپنے گھروں سے دور مختلف شہروں میں زیر تعلیم ہیں مسلم اداروں کی طرف سے ان شہروں میں ہوسٹلوں کا خود نظام کیا جائے تاکہ ان کو اپنے پاس اپنی نگرانی میں رکھ کر اعلیٰ تعلیم کے مواقع فراہم کرنے کے ساتھ ان کی اخلاقی ودینی تربیت کی جاسکے اس کے لیے ان ہوسٹلوں میں نماز باجماعت کے اہتمام کے ساتھ روزانہ ایک گھنٹے کے دروس کے ساتھ ان کی ذہن سازی کا بھی کام کیا جائے، یاد رہے کہ عیسائی مشنریوں اور قادیانیوں کی طرف سے گذشتہ کئی سالوں سے خاموشی سے مسلم طلبا کو دین سے دور کرنے کی غرض سے پورے ملک میں اس کا جال پھیلایا جارہا ہے۔

(۸)۔ شہروں میں پہلے سے قائم اس طرح کے مسلم ہاسٹلوں یا اقامت گاہوں کے ذمہ داران سے اجازت لے کر ہفتہ میں دو تین دن عشاء بعد یا کسی اور مناسب وقت میں ان کی دینی تعلیم کا نظم کیا جائے اور اس کے لیے اچھے معیاری علماء وعالمات کا انتخاب کیا جائے، جو ان نوجوانوں وبچیوں کی نفسیات کو سامنے رکھ کر ان کی دینی تربیت کا فریضہ انجام دے سکیں۔

(۹)۔ اگر مسلم اسکولوں یا کالجس کے ذمہ داران اپنی سیکولر امیج کی بقا کی فکر میں اپنے یہاں زیر تعلیم طلبا کی دینی تعلیم کے لیے نظم کرنے اور اس کے لیے علماء کے تقرر پر آمادہ نہ ہوں تو ان سے کہا جائے کہ ہمارا ادارہ اپنے خرچ پر دینی تعلیم کے معلمین آپ کو فراہم کرنے کے لیے تیار ہے، آپ صرف اس کے لیے اسکول شروع ہونے سے پہلے ہمیں آدھے گھنٹہ کا وقت دیں اور بچوں کو صبح میں صرف آدھ گھنٹہ جلدی لانے کا نظم کریں، ملک کے مختلف مسلم

اداروں کی طرف سے تنخواہیں دے کر دوسرے مسلم اسکولوں میں اسلامیات کے معلمین فراہم کرنے کا کامیاب تجربہ الحمدللہ ملک کے مختلف شہروں کوکن، اورنگ آباد، حیدرآباد وغیرہ میں ہورہا ہے، اب اس تجربہ کو دوسرے شہروں تک وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱۰)۔ سول سروس میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے جو ادارے مثلاً جے پور کی کریسنٹ اکیڈمی، دہلی کی ہمدرد یونیورسٹی یا ممبئی کا حج ہاؤس وغیرہ سینکڑوں مسلم طلبا کو کامیاب تربیت دے رہے ہیں وہاں زیرِ تعلیم طلبا کی دینی ذہن سازی کا کام وہاں کے مقامی علماء یا دینی اداروں کی طرف سے ابھی سے کیا جائے تاکہ مستقبل قریب میں ملک میں بڑے سرکاری مناصب پر فائز ہونے کے بعد بھی ان کی دینی شناخت باقی رہ سکے اور وہ ملک کی انتظامیہ میں بھی پہنچ کر اسلام کی صحیح ترجمانی کا فریضہ انجام دے سکیں۔

(۱۱)۔ مشنری، غیر اسلامی اور سرکاری اسکولوں میں زیرِ تعلیم طلبا کے لیے سنڈے کلاسس کا اچھے پیمانہ پر خود ہمارے دینی مدارس میں نظم کیا جائے، اس کا ہم نے سنگاپور کے اپنے گذشتہ سفر میں مشاہدہ کیا، الحمدللہ یہ بڑا کامیاب تجربہ ہے، یونیفارم کے ساتھ اتوار کے دن تین گھنٹے کے یہ کلاسس ہوتے ہیں جو بڑے کامیاب ہیں اور اسلامیات کے امتحانات کے بعد ان کو ترغیبی انعامات گولڈ میڈل وسلور میڈل وغیرہ کی شکل میں دیئے جاتے ہیں۔

(۱۲)۔ اسکولوں وکالجس کی سالانہ چھٹیوں میں مختصر مدتی ہفت روزہ، پندرہ روزہ دینی کورسس کا نظم خود ہمارے علماء یا ذمہ داران خود اپنے مدارس کی چہار دیواری میں یا شہروں میں اچھی اور پُرکشش جگہوں میں کریں، اگر ممکن ہو تو مدارس میں قیام کروا کر ان بچوں کی دینی تربیت بھی کی جائے، اس دوران ان کی دلچسپی وترغیب کے لیے کھیل کود کے مقابلے بھی رکھے جائیں اور کیمپ کے اختتام پر ان کو ایک آدھ دن کے لیے شہر سے دور تفریح کے لیے لے جا کر اس دوران ان پر ہونے والی تربیتی وتعلیمی محنت کا جائزہ بھی لیا جائے۔

سب سے آسان اور فوری قابل عمل نسخہ:۔

اسلام پر بڑھتی اعتماد کی کمی میں اب ہمارے ملک میں صرف خوش حال گھرانوں کے بچے اور بچیاں نہیں رہ گئے ہیں، اعلیٰ تعلیم کے شوق میں اسکالرشپ یا دوسروں کی مدد سے تعلیم حاصل کرنے والے درمیانی یا غریب گھرانوں کی اولاد کا بھی حال کچھ کم قابلِ تشویش نہیں ہے، تعلیم سے فراغت کے بعد شادی سے پہلے ملازمت کے نہ ملنے پر گھروں میں بے کار بیٹھے رہنا ان کے لیے گوارا ہے، لیکن ایک سالہ عالمیت کے مختصر مدتی کورس میں داخلہ لینا ان کے لیے سببِ عار ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے زعم میں وہ اس کو اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں، اب ایسے بچوں اور بچیوں کو ہم جبر واکراہ سے دینی مدارس میں داخل نہیں کرسکتے، والدین اگر ذہناً بھی تیار ہوجائیں تو بچے آمادہ نہیں، اگر بچوں کو شوق ہوجائے تو والدین وسرپرست ان مدارس میں اپنے نونہالوں کو بھیجنا اپنی شان کے منافی سمجھ کر ان کو روک دیتے ہیں، ان سب محرکات کے تناظر میں ایک کامیاب، آسان اور عملی شکل جو ہوسکتی ہے وہ یہ کہ ان کو اس کے لیے ایک سالہ یا دوسالہ عالمیت کورس کے نام سے دعوت نہ دی جائے، بلکہ صرف یہ کہا جائے کہ صرف ایک ہفتہ یا پندرہ دن یا ایک ماہ کا کورس ہے، وہ بھی صرف روزانہ ایک گھنٹہ کے لیے، ہفتہ میں اتوار کو چھوڑ کر صرف چھ دن، اس کو آپ اپنی جاری تعلیم یا ملازمت یا گھریلو یا خانگی مشغولیات کے ساتھ بھی پورا کرسکتے ہیں، مثلاً آپ کالج یا یونیورسٹی یا کمپنی کی ملازمت سے شام کو پانچ بجے فارغ ہوتے ہیں تو چھ بجے تک گھر پہنچ کر گھریلو ضروریات سے فارغ ہوکر ۶ سے ۷ یا ۷ سے ۸ یا ۸ سے ۹ کا وقت دیں، ایک ہفتہ کے اس دینی کورس میں آپ کا جی لگے تو پندرہ دن کا کریں، پندرہ دن تک پسند آئے تو پھر ایک ماہ، اسی طرح سہ ماہی اور ششماہی قرآنی ودینی نصاب مکمل کریں، کالجس میں زیرِ تعلیم یا وہاں سے فارغ طالبات یا طلبا جب اس پُرکشش قرآنی ودینی نظام میں شرکت پر آمادہ ہوجائیں تو ذمہ داران اور معلمین ومعلمات کو یہ سمجھ لینا ہے کہ پہلے ہفتہ ان کو صرف سورہ فاتحہ کے ساتھ چھ سورتیں اور نماز کے پورے اذکار زبانی یاد کرانے ہیں اس کے ساتھ ایک صفحہ ناظرہ قرآن درست کرانا ہے، روزانہ پانچ مسائل بتانے ہیں، ایمانیات پر روزانہ دس منٹ بات کرنی ہے جس میں شرک وکفر کی

جزئیات کو بیان کرنے کے ساتھ اللہ تعالی کی قدرتوں، کمالات واختیارات اور بے پناہ تصرفات کے مالک ہونے کو بیان کرنا ہے، پانچ منٹ سیرت نبوی کی اہم باتیں خلاصہ کے طور پر بیان کرنی ہیں اسی طرح روزانہ ان کو ایک سنت پر عمل کرنے کی ترغیب دینی ہے مثلاً پہلے دن باوضو رہنے، دوسرے دن اول وقت میں نماز پڑھنے، تیسرے دن رات کو سورہ معوذتین پڑھ کر سونے وغیرہ کی فضیلت کی روزانہ ایک سنت پر عمل کی ان کو ترغیب دینی ہے اور ہر دوسرے دن اس کا جائزہ بھی لینا ہے، اس پورے پس منظر میں ضروری ہے کہ ان بچوں اور بچیوں کے مزاج اور نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کو گھر کے ماحول کی طرح اس تعلیم کے دوران پُرکشش ماحول فراہم کیا جائے تاکہ ان کو وحشت نہ ہو، ذاتی یا کرایہ کی جس عمارت میں بھی اس جزوقتی مدرسہ کا نظم ہو وہ دلکش ہو، صفائی ستھرائی کا خیال رکھا جائے، اچھے علاقہ میں اس کا محل وقوع ہو، غرض یہ کہ وہ سب اسباب ووسائل جن کے نہ ہونے سے اچھے گھرانوں کے اور عصری تعلیم یافتہ بچے اور بچیاں مدارس سے آج کل بہانہ بنا کر وحشت محسوس کرتے ہیں، ہمیں اسلامی حدود میں رہتے ہوئے جائز حد تک ان سب طبعی ضروریات کا انتظام کرنا ہے، حسبِ ضرورت ان کو گھروں سے لانے لے جانے کے لیے سواریوں کا بھی نظم کرنا ہے۔ اس طرح امید ہے کہ جو نوجوان بچیاں اور بچے مدرسوں میں آنے سے کتراتے ہیں یا جن کے پاس اپنی ملازمتوں یا تعلیم میں مشغولیت کی وجہ سے مستقل اپنا وقت بنیادی دینی تعلیم کے لیے فارغ کرنے کی گنجائش نہیں وہ مختصر وقتی ان کورسوں سے بڑی آسانی سے فائدہ اٹھا پائیں گے، اگر کسی نے تین ماہ، چھ ماہ یا ایک سال کا کورس مکمل بھی نہیں کیا، صرف ایک دو ہفتہ تک ہی فائدہ اٹھایا تو کم از کم روزمرہ کے اہم دینی فرائض سے واقف ہو جائیں گے اور حرام وحلال کے تعلق سے موٹی موٹی باتیں ان شاء اللہ ان کے ذہن نشین ہو جائیں گی، الحمدللہ ہمارے جامعہ کے فارغین کی طرف سے اکیڈمی کے زیر اہتمام اسی ضرورت کے پیشِ نظر کچھ ہی دنوں قبل مذکورہ مختصر مدتی اس نصابی تجربہ کو عمل میں لایا گیا ہے اور اس کے لیے مستقل مختصر ومتوسط نصاب بھی ترتیب دیا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کے بڑے اچھے اثرات مرتب ہو رہے ہیں، اپنے یہاں اس نظام کا تجربہ کرنے کی خواہش رکھنے والے اس سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں دینی مدارس کے ذمہ دارن کا فریضہ:۔ اگر دینی مدارس کے ذمہ داران اور علماء کے پیشِ نظر یہ بات رہے کہ دینی مدارس کا م صرف مدرسہ کی چہار دیواری میں موجود طلبا وطالبات کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے تک محدود نہیں بلکہ امتِ مسلمہ اور نئی نسل کی وہ بہت بڑی تعداد جو مادیت اور مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر دینی تعلیم سے کوسوں دور ہے بلکہ اسلام پر اعتماد کی بڑھتی کمی کے ساتھ وہ غیر شعوری طور پر الحاد وارتداد کی طرف جا رہی ہے ان کو ان کی جگہ رکھتے ہوئے بنیادی دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کا فریضہ بھی ہمارا ہی ہے اور ہمیں ہی ان شاء اللہ حکمت وموعظت کے ساتھ شریعت کے حدود میں رہتے ہوئے ترغیبی وجدید ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے ان کو ایمان واسلام پر باقی رکھنے کی فکر کرنا ہے۔ اس طرح مذکورہ بالا تمام ممکنہ عملی تجاویز کو روبعمل لانا بہت آسان ہو جاتا ہے، اس کے لیے صرف اپنی فکر کو وسعت دینے اور اپنی دینی تعلیمی خدمات کے موجودہ دائرہ کو صرف تھوڑا سا وسیع کرنے کی ضرورت ہے مثلاً اب تک ہمارے مدرسہ کے پچاس لاکھ کے سالانہ بجٹ سے پانچ سو طلبا کی دینی تعلیم کا نظم ہو رہا ہے تو اس میں اب صرف دس فیصد اپنے اضافہ کے ساتھ سالانہ پانچ لاکھ شامل کرنے یا اسی بجٹ میں اس رقم کو خاص کرنے سے ایک ہزار طلبا کی بنیادی دینی تعلیم کا فریضہ مدرسہ ہی کی سرپرستی میں ہم بآسانی انجام دے سکتے ہیں، اس طرح نئی نسل میں بڑھتی اسلام پر اعتماد کی کمی کے سیلاب پر بند بھی باندھا جا سکتا ہے اور ان شاء اللہ فکری وذہنی ارتداد کا بھی سدباب ہو سکتا ہے۔

شاید کہ اتر جائے ترے دل میں میری بات
آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے

☆☆☆

❑ فکر اسلامی

(قسط-۲۰)

مفکر اسلام- ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

اللہ کی حکومت کے قیام کی کو شش:

حضرت مولاناؒ نے اپنے جد امجد حضرت سید احمد شہیدؒ کی سیرت دو ضخیم جلدوں میں پیش کی ،لیکن اس سے بھی زیادہ پر تا ثیر کام ان کی کتاب ''جب ایمان کی باد بہاری چلی'' ہے،جس میں انھوں نے واقعاتی انداز میں سید صا حبؒ کی تحریک اصلاح و جہاد کو پیش کیا ہے، اور ان کی دعوت وعزیمت کے واقعات کو سحر آفریں اسلوب میں بیان کیا ہے۔''شہدائے بالا کوٹ کا مقام و پیغام''عنوان کے تحت مولاناؒ نے جو وضاحت فرمائی ہے دراصل اس کی اہمیت وضرورت تا قیامت باقی رہے گی ،تا آنکہ اس طرح کی اسلامی حکومت قائم نہ ہو جائے ،اس نظریہ سے ہٹ کر جو بھی کام کیا جائے وہ اپنی جگہ ٹھیک !لیکن اس ہدف کے حصول کے لئے اس طرح کی کوشش کر نی ہی پڑے گی اس سے مفر نہیں، کہ یہی اصل مقصد ہے:

''یوں تو شہدائے بالا کوٹ میں سے ہر فرد کا پیغام یہ ہے کہ ﴿یا لیت قو می یعلمون،بما غفر لی ربی و جعلنی من المکرمین﴾(یٰس :۲۶۔۲۷) گر گوش شنوا اور دیدۂ بینا کے لئے ان کا مجموعی پیغام یہ ہے کہ ہم ایک ایسے خطۂ زمین کے حصول کے لئے جد جہد کرتے رہے ، جہاں ہم اللہ کے منشا اور اسلام کے قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گذار سکیں، جہاں ہم دنیا کو اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرے کا نمونہ دکھا کر اسلام کی طرف مائل اور اس کی صداقت وعظمت کا قائل کر سکیں ، جہاں نفس و شیطان ،حاکم و سلطان اور رسم و رواج کے بجائے خالص اللہ کی حکومت و اطاعت ہو ﴿ویکون الدین کلہ للہ﴾(الانفال:۳۹) جہاں طاعت وعبادت اور اصلاح وتقویٰ کے لئے اللہ کی زمین وسیع اور فضا سازگار رہو،اور فسق و فجور و معصیت کے لئے زمین تنگ اور فضا ناسازگار رہو، جہاں ہم کو صدیاں گذر جانے کے بعد پھر ﴿الذین ان مکنٰھم فی الارض أقامو االصلوٰۃ وآتو الزکوٰۃ وأمروا بالمعروف ونھو ا عن المنکر﴾(الحج:۴۱) کی تفسیر اور تصویر پیش کرنے کا موقع مل سکے،تقدیر الٰہی نے ہمارے لئے اس سعادت ومسرت اور اس کی آرزو کی تکمیل کے مقابلے میں جنگ کی شہادت اور اپنے قرب ورضا کی دولت کو ترجیح دی،ہم اپنے رب کے اس فیصلہ پر رضا مند وخورسند ہیں،اب اگر اللہ تعالی نے تم کو دنیا کے کسی حصہ میں کوئی خطۂ زمین عطا فرمایا ، جہاں تم اللہ کے منشا اور اسلام کے قانون کے مطابق آزادی کے ساتھ زندگی گذار سکو،اور اسلامی زندگی اور اسلامی معاشرہ کے قائم کرنے میں کوئی مجبوری مخل اور کوئی بیرونی طاقت حائل نہ ہو، پھر بھی تم اس سے گریز کرو ،اور ان شرائط و اوصاف کا ثبوت نہ دو ، جو مہاجرین ومظلومین کے اقتدار اور سلطنت کا تمغۂ امتیاز ہیں تو تم ایسے کفران نعمت اور ایک ایسی بدعہدی کے مرتکب ہو گئے ،جس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔''(جب ایمان کی باد بہاری

چلی:ص۔۲۹۱تا۲۹۳)

اوراگر خدانخواستہ ایسا موقع ہاتھ آجائے جیسا کہ دنیا کے نقشہ پر متعدد مسلم ممالک ہیں لیکن پھر بھی اسلام کی حکمرانی نہ ہو سکے تو یہ کھلی بغاوت وسرکشی ہے،ایسے ممالک میں تو اس پیغام کی ضرورت اور دو بالا ہو جاتی ہے ،راقم کی نظر میں عرب ممالکمیں مجاہدین نے جو کام کیا اور جو کردار ادا کیا اگر وہ مخلص تھے اسلام کی بالا دستی کے لئے تو اس اقتباس کی رو سے وہ تائید کے مستحق اور عنداللہ ماجور ہوں گے،اس لیے کہ جب کہ مطالبہ تھا قیامت باقی رہے گا تو پھر سیاسی اقدام،خواہ جمہوریت کی راہ سے ہو یا کسی اور طریقہ سے غلط کیوں کر ہوسکتا ہے اگر نیت اسلام کی نشر واشاعت اور اس کے نفاذ کی ہو،لیکن افسوس کہ ایسا واضح پیغام ہونے کے باوجود بھی دین کی بالا دستی کے خواہش مندوں کی وہ نصرت وحمایت ہمارے متدین حلقوں سے نہ ہوئی جو ہونی چاہیے تھی۔

فضلائے مدارس کو مشورہ:

اس رو بہ زوال دور میں مدارس اسلامیہ بھی اپنے کام اور مقام سے ہٹے ہیں، مادیت اور تعیش پسندی کا وہ مرض وہاں بسنے والوں کو بھی کسی نہ کسی درجہ میں لاحق ہوا ہے جس میں معاشرے کے دوسرے طبقات گرفتار ہیں حتی کہ اسی وجہ سے اب وہ بھی قیادت وحق گوئی سے ہچکچانے لگے ہیں:

''مدارس عربیہ کو تقریروں میں بتایا گیا کہ عہد حاضر کا چیلنج کیا ہے اور علماء کے کیا فرائض ہیں،سب سے بڑا چیلنج مادیت ہے، اور اس پر غالب آنے کے لئے جو قوت درکار ہے وہ ایمان راسخ،علم عمیق زہد وقناعت،خودداری وخود اعتمادی ہے، اور یہی وہ ہتھیار ہیں،جن سے اپنے اپنے زمانہ کے علماء نے اپنی عظمت کا سکہ معاشرہ پر بٹھایا،اور بڑے بڑے جباروں کی گردن ان کے سامنے جھک گئی،آج بھی ان بوریہ نشینوں کی ضرورت ہے، جو ان صفات سے متصف ہوں ، اس خلا کو جو ہمارے معاشرہ میں اس عنصر کے نہ ہونے سے پیدا ہو گیا ہے، اور جس سے معاشرہ انتشار اور دانشور طبقہ جوع البقر میں مبتلا ہے، ان نائبین رسولؐ کے سوا کوئی پر نہیں کر سکتا جو کتاب و حکمت کے ساتھ ''تزکیہ نفس'' کے بھی حامل ہوں،علوم دینیہ کے طلبہ وفضلاء سے کہا گیا کہ انقلاب زمانہ کا شکوہ بے کار ہے، سنن الٰہیہ نا قابل تبدیل ہیں،ان میں ایک نافعیت کا احترام و اعتراف اور نافع کی تلاش وطلب ہے، نافعیت اور صلاحیت و افادیت میں خدا نے تسخیر کی قوت اور مقناطیس کی کشش رکھی ہے،آپ کسی علم میں امتیاز واختصاص پیدا کریں آنکھوں کا تارا بن جائیں گے ؎

کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی''

(کاروان زندگی ج۲ص۲۶۵)

علماء کے فرائض

حضرت مولاناؒ کس قدر دور اندیش تھے اور تاریخ کا کتنا گہرا مطالعہ تھا پھر حالات سے کس حد تک واقف تھے،اکتوبر ۱۹۸۲ء میں علماء اور دانشوروں کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے جو کچھ کہا اس سے اندازہ ہوتا ہے ، ایک طرف ہندوستان کا روایت پسند ماحول،مختلف حیثیتوں سے منقسم طبقاتی نظام اور اس پر حضرت مولانا کا یہ صریح اور حقیقت پسندانہ تجزیہ وتبصرہ یہ احساس دلاتا ہے کہ ہم آج بھی وہی خطا کر رہے ہیں جس کے نہ کرنے کی ایک دور اندیش و دور بیں اور زمانہ شناس مفکر نے بہت پہلے تنبیہ کی تھی،کاروان زندگی کا یہ فکر انگیز،حقائق سے لبریز،تفکر آمیز اور ماحول ورائج نظام پر جرأت مندانہ تبصرہ ملاحظہ فرمائیے:

''علماء کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کو زندگی کے حقائق، ملک کے حالات، ماحول کے تغیرات اور تقاضوں سے باخبر اور

روشناس رکھیں، ان کی کوشش رہنی چاہئے کہ مسلم معاشرہ کا رابطہ زندگی اور ماحول سے کٹنے نہ پائے ،اسلئے کہ اگر دین اور مسلمان کا رابطہ زندگی سے کٹ گیا، اور وہ خیالی دنیا میں زندگی گزارنے لگے تو پھر دین کی آواز بے اثر ہوگی، اور وہ دعوت و اصلاح کا فرض انجام نہیں دے سکیں گے، اور اتنا ہی نہیں ہوگا، بلکہ اس دین کے حاملین کو اس ملک میں رہنا مشکل ہوجائے گا، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جہاں علماء نے سب کچھ کیا، لیکن زندگی کے حقائق سے امت کو روشناس نہیں کیا، اس ماحول میں اپنے فرائض کے انجام دینے کی انہوں نے تلقین نہیں کی، ایک اچھا شہری، ایک مفید عنصر بننے اور اس ملک کی قیادت حاصل کرنے کی اہلیت پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی، وہاں اس ملک نے ان کو اس طرح اگل دیا جیسے لقمہ اگلا جاتا ہے، اور ان کو اگل کر باہر پھینک دیا، اس لئے کہ انہوں نے اپنی جگہ نہیں بنائی تھی۔

آج ہندوستان کے مسلمان ایک دانشمندانہ اور حقیقت پسندانہ دینی قیادت کے محتاج ہیں، آپ اگر مسلمانوں کو سو فی صدی تہجد گزار بنادیں، سب کو متقی و پرہیزگار بنادیں، لیکن ان کا ماحول سے کوئی تعلق نہ ہو، وہ یہ نہ جانتے ہوں کہ ملک کدھر جارہا ہے، ملک ڈوب رہا ہے، ملک میں بداخلاقی ، وبا اور طوفان کی طرح پھیل رہی ہے، ملک میں مسلمانوں سے نفرت پیدا ہورہی ہے تو تاریخ کی شہادت ہے کہ پھر تہجد تو تہجد پانچ وقتوں کی نمازوں کا پڑھنا بھی مشکل ہوجائے گا، اگر آپ نے دینداروں کے لئے اس ماحول میں جگہ نہیں بنائی، اور ان کو ملک کا بے لوث مخلص اور شائستہ شہری ثابت نہیں کیا جو ملک کو بے راہ روی سے بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، اور ایک بلند کردار پیش کرتا ہے، تو آپ یاد رکھئے کہ عبادات ونوافل اور دین کی علامتیں اور شعائر تو الگ رہے، وہ وقت بھی آسکتا ہے کہ مسجدوں کا باقی رہنا بھی مشکل ہوجائے، اگر آپ نے مسلمانوں کو اجنبی بنا کر اور ماحول سے کاٹ کر رکھا ، زندگی کے حقائق سے ان کی آنکھیں بند رہیں، اور ملک میں ہونے والے انقلاب ، نئے بننے والے قوانین، عوام کے دل وماغ پر حکومت کرنے والے رجحانات سے وہ بے خبر رہے تو پھر قیادت تو الگ رہی (جو خیر اُمت کا فرض منصبی ہے) اپنے وجود کی حفاظت بھی مشکل ہوجائے گی'' (کاروان زندگی ج۲ص۳۷۲)

زبان کی اهمیت اور علماء کی قیادت

بنگلہ دیش میں مسلمانوں کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے جس طرح بنگلہ زبان میں مہارت کی تلقین کی اور علماء کی قیادت کو واضح کیا اس میں ہر جگہ اور ملک میں بسنے والے مسلمانوں کے لئے دعوت فکر اور درس وعبرت ہے:

''بنگلہ دیش میں اہل علم واہلِ فکر کی اس ذمہ داری پر روشنی ڈالی گئی کہ وہ بنگلہ زبان میں مہارت وقیادت کا مقام حاصل کریں، اور اپنی توجہ اور صلاحیت عربی اور اردو ہی پر (ثواب کا کام سمجھ کر) مرکوز نہ کریں، بنگالی زبان میں بھی امتیاز وتفوق پیدا کریں، اس خلا کے باقی رہنے کی حالت میں کہ لسانی وادبی، تحریری وخطابی، قیادت وزعامت، علماء اور زیادہ صحیح الفاظ میں اہل دین کے ہاتھوں میں نہیں رہتی، اور تجدد وترقی پسند طبقہ، یا مخالف اسلام عنصر کی اس پر اجارہ داری قائم ہوجاتی ہے، جن خطرات اور نقصانات کا اندیشہ ہے، ان کی نشاندہی کی گئی، اس سلسلہ میں علمائے ہند کی اس خصوصیت کا تذکرہ کیا گیا کہ انہوں نے زبان وادب اور جدید اسالیب سے اپنا رابطہ ٹوٹنے نہیں دیا اور وہ علم وادب اور ثقافت کے قافلہ سے بچھڑنے نہیں پائے، ماضی میں اردو ایوان ادب کے چار ستون تھے، اور وہ چاروں قدیم نظام تعلیم کے پروردہ تھے۔'' (کاروان زندگی ج۳ص۵۹)

(.....**جاری**)

☆☆☆

❑ انکار حدیث

فتنۂ وضع کے مقابلے میں علماء ومحدثین کی خدمات

تحریر: ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم
تلخیص وترجمانی: محمد فرید حبیب ندوی

جوشخص بھی فتنۂ وضع کے مقابلے میں محدثین وعلماء کی کوششوں سے واقف ہوگا، وہ یہ تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انہوں نے یہ کام جس بہتر طریقہ سے انجام دیا، اس سے بہتر ممکن نہ تھا، اور انہوں نے پہلی مرتبہ علمی تنقید وتحقیق کا ایسا بلند معیار قائم کیا جس کی نظیر دوسری قوموں کی تاریخ میں نہیں ملتی، اور جو امت مسلمہ کے لئے وجہ افتخار ہے۔

فتنۂ وضع کا مقابلہ کرنے کے لئے علماء کرام نے جو اقدامات کیے اور ان کوششوں سے جو نتائج برآمد ہوئے، ان کی مختصر سی تفصیل آپ کے سامنے ہے:

۱۔ **سلسلۂ اسناد:** صحابہ کرام کے دور میں سند کا رواج نہیں تھا، اور نہ ہی تابعین کسی صحابی کی روایت کردہ حدیث میں سند کی تلاش کرتے تھے، لیکن جب فتنہ بھڑکا تو حضرات تابعین اور تبع تابعین بلکہ صغار صحابہ بھی اسناد کے بغیر کسی حدیث کو قبول کرنے سے احتراز کرنے لگے، چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ بشیر عدوی نے حضرت ابن عباسؓ کے سامنے آکر احادیث بیان کرنا شروع کیں، لیکن ابن عباسؓ نے اس پر کوئی توجہ نہ دی، وہ کہنے لگا: میں آپ کو حدیث رسول سناتا ہوں اور آپ توجہ ہی نہیں کرتے؟ حضرت نے فرمایا: پہلے تو جب کوئی شخص قال رسول اللہ ﷺ کہتا، تو ہم گوش برآواز ہوجاتے تھے، لیکن جب لوگوں نے جھوٹی سچی ہر طرح کی حدیثیں بیان کرنا شروع کردیں تو ہم نے تحقیق شروع کردی، چنانچہ اب ہم انھی احادیث کو قبول کرتے ہیں، جن سے واقف ہوتے ہیں۔

ابن مبارکؒ کا قول ہے: اسناد دین کا حصہ ہے، اگر سند نہ ہوتی، تو جس کا جو جی چاہتا، بیان کرتا۔

اس طرح علماء نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حدیث بیان کرنے کے لئے سند کی شرط لگادی، تاکہ ہر کوئی ادھر ادھر کی باتوں کو حدیث کے نام سے نہ بیان کرنے لگے۔

۲۔ **حدیث کی تحقیق کے لئے سفر:** یہ اس امت پر اللہ تعالیٰ کا کرم ہوا کہ اس نے بعض صحابہ کی عمریں دراز فرمائیں، اور طرح وہ لوگوں کے لئے مرجع بنے، چنانچہ جب حدیثوں میں جھوٹ بولنے کا رواج ہوا، تو محدثین ان صحابہ کے پاس جاتے اور ان سے حدیث کی تحقیق کرتے، اس مقصد سے بہت سے تابعین بلکہ بعض صحابہ کرام نے ایک شہر سے دوسرے شہر بلکہ ایک ملک سے دوسرے ملک کے بہت سے سفر کیے، چنانچہ حضرت جابرؓ کا ایک ایک حدیث کے لئے شام کا سفر اور حضرت ابوایوبؓ کا مصر کا سفر بڑا مشہور ہے۔

۳۔ **رواۃ کی تنقید:** نقد رجال فن حدیث کا ایک اہم باب ہے، علماء جرح وتعدیل نے اس سلسلے میں ایسی جانکاہ محنتیں کی ہیں کہ ان کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے، ایک ایک راوی کی ولادت ووفات، سیرت وکردار اور تمام ضروری احوال کی تحقیق کی اور اس سلسلے میں کسی کی ملامت کی کوئی پرواہ نہ کی۔

اس سلسلے میں محدثین نے کچھ اصول وضوابط بنائے کہ کن راویوں کی روایات قابل قبول ہوں گی اور کن کی نہیں، متروک الحدیث راویوں کی قابل ذکر اقسام مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ **رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ باندھنے والے:** رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ باندھنے والے کی روایت بالاتفاق مردود ہے، اور یہ اکبر کبائر میں سے ہے، حتی کہ اس سلسلے میں علماء کی دو رائیں ہیں کہ ایسا شخص دائرہ اسلام میں رہے گا یا اس سے خارج ہوجائے گا، اگرچہ

اکثر لوگوں نے اسے کافر تو نہیں مانا ہے، لیکن یہ کہا ہے کہ اس کا قتل واجب ہے، اسی طرح اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ اس کی توبہ قبول کی جائے گی یا نہیں؟ امام احمد اور امام بخاری کے استاد شیخ حمیدی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس کی توبہ قبول نہ کی جائے گی، جبکہ دیگر حضرات کہتے ہیں کہ اس کی توبہ قبول کر لی جائے گی، ابو مظفر سمعان نے نے کہا ہے کہ جس نے ایک حدیث میں جھوٹ بول دیا، تو اس کی تمام مرویات ساقط الاعتبار ہو جائیں گی۔

۲۔ عام زندگی میں جھوٹ بولنے والے: اگر کسی نے اپنی زندگی میں ایک مرتبہ بھی جھوٹ بولا تو اس کی روایات ترک کر دی جاتی ہیں۔ امام مالک نے چار طرح کے لوگوں کے بارے میں کہا ہے کہ ان سے علم (حدیث) نہیں لیا جائے گا، ان میں سے ایک کے بارے میں فرمایا: ''وہ شخص جو عام گفتگو میں جھوٹ بولتا ہو، اگر چہ میں اسے یہ تہمت تو نہیں دیتا کہ وہ رسول اللہ ﷺ پر جھوٹ باندھے گا، لیکن عام زندگی میں جھوٹا ہونے کی وجہ سے حدیث میں اس کا اعتبار ختم ہو جائے گا۔''

اگر ایسا شخص سچی توبہ کر لے، تو جمہور اس کی روایات قبول کرنے کے قائل ہیں، جب کہ ابو بکر صیرفی کہتے ہیں کہ جس شخص کی روایات ہم نے جھوٹ کی وجہ سے ایک مرتبہ ساقط کر دیں، تو دوبارہ اس کی روایات قبول نہ کریں گے''۔

۳۔ مبتدعین: بدعتی کی بدعت اگر موجب کفر ہو، تو اس کی روایت کے ترک پر سب کا اتفاق ہے، اسی طرح اگر اس کی بدعت موجب کفر تو نہ ہو، لیکن وہ جھوٹ بولنے کو جائز سمجھتا ہو، تب بھی اس کی روایت کے ترک میں کوئی اختلاف نہیں۔

اختلاف اس صورت میں ہے کہ اگر وہ جھوٹ کو حلال نہ سمجھتا ہو، تو اس کی رویت قبول کی جائے گی یا نہیں؟ اسی طرح اس بارے میں بھی اختلاف ہے کہ کیا بدعتی کے بارے میں اس سلسلے میں تفریق کی جائے گی کہ وہ اپنی بدعت کی طرف دوسروں کو دعوت دینے والا ہے یا نہیں؟

ابن کثیر فرماتے ہیں: ''اکثر علماء اس بات کے قائل ہیں کہ اگر بدعتی شخص اپنی بدعت کی طرف دعوت دینے والا ہے، تب تو اس کی روایت ترک کر دی جائے گی، ورنہ نہیں۔ ابن حبان نے اس پر اتفاق کا دعویٰ کیا ہے، لیکن ابن حبان کا اس بات پر اتفاق ہونے کا دعویٰ درست نہیں معلوم ہوتا، اس لئے کہ خود امام بخاری نے عمران بن حطان خارجی کی روایت لی ہے، جب کہ یہ شخص خارجی تھا اور اپنے مسلک کا پر زور داعی تھا'' اسی طرح امام شافعی کا قول ہے: ''میں روافض کے فرقہ خطابیہ کے سوا سب بدعتی راویوں کی روایت قبول کرتا ہوں، خطابیہ کی اس لئے نہیں قبول کرتا کہ یہ اپنے مسلک کی تائید میں جھوٹ بولنے کو جائز سمجھتے ہیں۔ عبد القادر بغدادی نے اپنی کتاب ''الفرق بین الفرق'' میں نقل کیا ہے کہ امام شافعی نے اپنے اس قول سے رجوع کر لیا تھا۔ اور وہ اہل بدعت کی مرویات کو قبول نہ کرنے کے قائل ہو گئے تھے، البتہ معتزلہ کی روایات کو پھر بھی قبول کر لیتے قائل تھے''۔

اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ محدثین بدعتی کی ایسی روایت کو قبول نہیں کرتے تھے جس سے اس کے مسلک کی تائید ہوتی ہو، یا وہ ان لوگوں میں سے ہو جو جھوٹ بولنے کو جائز سمجھتے ہوں، اور اپنے مسلک کے اثبات کے لئے حدیثیں وضع کرتے ہوں، یہی وجہ ہے کہ محدثین نے روافض کی مرویات کو رد کر دیا، جبکہ بعض ایسے شیعوں کی روایات کو قبول کر لیا، جو صدق وامانت میں معروف تھے، اسی طرح انہوں نے اس بدعتی کی روایت کو بھی قبول کر لیا، جو جھوٹ کو جائز نہ سمجھتا ہو، جیسے عمران بن حطان کی روایات کو محدثین نے قبول کیا ہے۔

۳۔ زنادقہ، فساق اور مغفلین: زندیق، فاسق اور ایسے مغفل روای، جو اپنی بیان کردہ روایت کو سمجھ نہ سکیں، اور ایسے تمام لوگ جن میں ضبط وعدالت اور فہم کی صفات نہ پائی جائیں، ابن کثیر نے لکھا ہے: اس راوی کی روایت قبول ہوگی جو مقبول، ثقہ اور اپنی روایت کو صحیح سے ضبط کرنے والا ہو، اور عاقل بالغ مسلمان، نیز اسباب فسق اور خلاف مروءت چیزوں سے پاک ہو، اسی طرح وہ بیدار مغز اور ہوشیار ہو، غفلت شعار نہ ہو، اگر اپنے حافظہ سے روایت کرے تو قوی الحافظہ ہو اور اگر روایت بالمعنی کرے تو الفاظ حدیث کو سمجھنے والا بھی ہو، اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی مفقود ہوگی، تو اس کی روایت قبول نہ ہوگی۔

ان کے علاوہ جن راویوں کی روایات میں توقف کیا جاتا ہے، ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہیں:

(۱)۔ ایسا راوی کہ بعض علماء اس کی جرح کرتے ہوں اور بعض تعدیل۔(۲)۔جس سے اکثر غلطی سرزد ہوتی ہو اور وہ ثقہ راویوں کی مخالفت کرتا ہو۔(۳)۔بہت زیادہ بھولنے والا ہو۔(۴)۔آخری عمر میں جس کا دماغ خراب ہوگیا ہو۔(۵)۔جس کا حافظہ خراب ہو۔ (۶)۔جو بلا امتیاز ثقہ وغیر ثقہ ہر طرح کے راوی سے روایت کرتا ہو۔

۴۔ حدیث کی تمیز وتقسیم کے قواعد وضوابط وضع کرنا: محدثین نے حدیث کی تین قسمیں ہیں، صحیح، حسن، ضعیف۔

صحیح: صحیح وہ حدیث ہے جس کی سند متصل ہو، اور جسے عادل و ضابط راوی نے اپنے جیسے راوی سے روایت کیا ہو، اور اس طرح یہ سلسلہ سند رسول اللہ ﷺ یا صحابی یا تابعی تک جا پہنچا ہو، اور وہ شاذ و مردود نہ ہو اور اس میں کوئی علت قادحہ نہ پائی جائے۔

صحیح حدیث میں سند کا متصل ہونا ضروری ہے، چنانچہ اگر درمیان سے سند منقطع ہوجائے تو وہ قابل قبول نہ ہوگی، انقطاع سند کی ایک قسم مرسل ہے، جس میں صحابی کا نام مذکور نہیں ہوتا ہے۔ جمہور محدثین مرسل روایت کو قبول نہیں کرتے اور اسے قابل حجت نہیں سمجھتے ہیں، البتہ فقہاء کے درمیان اس کے قبول وعدم قبول میں اختلاف ہے۔

حسن: حدیث حسن کی تعریف میں علماء کا اختلاف ہے۔

ابن صلاح فرماتے ہیں: حسن کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ ایک حسن وہ ہے جس کی سند میں کوئی ایسا مستور الحال راوی ہو جس کی اہلیت ثابت نہ ہو، البتہ وہ مغفل اور کثیر الخطاء اور متہم بالکذب نہ ہو، اور وہ حدیث دوسری سند سے بھی منقول ہو۔

۲۔ وہ حدیث جس کا راوی صدق وامانت میں مشہور ہو، البتہ وہ حفظ واتقان میں صحیح کے راوی سے کم ہو، اور ایسا ہو کہ اس کی انفرادی روایت کو منکر نہ سمجھا جاتا ہو، نیز اس کی حدیث کا متن شاذ اور معلل بھی نہ ہو۔

یہ یاد رہے کہ حدیث حسن کی اصطلاح امام احمد اور امام بخاری کے زمانے میں پیدا ہوئی اور پھر مشہور ہوگئی، اس سے پہلے یہ اصطلاح رائج نہ تھی۔

ضعیف: وہ حدیث جس میں صحیح اور حسن کی صفات نہ پائی جائیں، ضعف کبھی متن میں ہوتا ہے اور کبھی سند میں۔ ضعیف حدیث کی بہت سی قسمیں ہیں:

۱۔ **مرسل:** اس کی مختصر تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

جمہور محدثین اسے حجت نہیں مانتے۔ یہ حدیث رسول میں احتیاط کا انتہائی درجہ ہے۔ اس لئے کہ مرسل روایت میں صحابی حذف ہوتا ہے اور صحابہ سب کے سب ثقہ ہیں، مگر اس کے باوجود یہ حضرات اس کے ضعف پر متفق ہیں۔

۲۔ **منقطع:** جس کی سند میں صحابی کے سوا کوئی اور راوی ساقط ہوگیا ہو۔

۳۔ **معضل:** جس کی سند میں لگاتار دو راوی ساقط ہوں۔ اگر تبع تابعی حضور اکرم ﷺ سے براہ راست روایت کرے تو اسے بھی معضل کہتے ہیں۔

۴۔ **شاذ:** امام شافعی نے شاذ کی تعریف یہ کی ہے: ''جب ثقہ راوی ایسی روایت بیان کرے جو دوسرے لوگوں کی روایت کے خلاف ہو، تو وہ شاذ ہے، اور اس کے بارے میں توقف کیا جائے گا''۔ دیگر حفاظ حدیث نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے: ''جس حدیث کی ایک ہی سند ہو اور اسے روایت کرنے والا منفرد ہو، خواہ ثقہ ہو یا غیر ثقہ، اگر ثقہ راوی منفرد ہے تو اس میں توقف کیا جائے گا اور اس سے استدلال کیا جائے گا، اور اگر وہ غیر ثقہ ہے تو اسے رد کر دیا جائے گا''۔

۵۔ **منکر:** وہ حدیث جس کو روایت کرنے میں ایسا راوی منفرد ہو جو نہ عادل ہو نہ ضابط، ایسی روایت نا قابل قبول ہوگی۔

۶۔ **مضطرب:** جس حدیث کے متن یا سند میں اختلاف ہو، اور دونوں طرح کی روایات اس طرح صحیح ہوں کہ ایک کو دوسری پر ترجیح دینا ممکن نہ ہو، تو اسے مضطرب کہتے ہیں، یہ راویت ضعیف ہوتی ہے، البتہ اگر اختلاف بہت معمولی ہو، مثلاً راوی کے نام، اس کے والد کے نام یا اس کی نسبت میں اختلاف ہو، ویسے وہ ثقہ ہو، تو پھر اسے صحیح مانا جائے گا۔ (السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی)

☆☆☆

❑ اصلاحیات

عجلت پسندی قرآن وحدیث کی روشنی میں

محمد عبداللہ بن شمیم ندوی
اسکالر: ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

اللہ تعالیٰ نے اپنی تمام مخلوقات میں انسان کو اشرف اور افضل بنایا ہے، انسان کو تمام مخلوقات پر یہ امتیاز ایسے ہی نہیں مل گیا بلکہ اسکی اہم وجہ انسان کے اعمال کے ساتھ جزا وسزا کا منسلک ہونا اور دیگر مخلوقات کے مقابلے میں بہت سی صفات کا حامل ہونا ہے۔ اللہ نے انسان کو جن صفات سے نوازا، ان میں سے کچھ تو انسان اور حیوان میں مشترک ہیں، جیسے بھوک لگنا، نیند کا آنا، محبت کرنا اور غصہ آنا وغیرہ، اور کچھ صفات میں انسان سب سے ممتاز ہے جیسے صفت ملوکیت، تعلیم وتعلم، تدبیر کرنا، ایجادات کرنا، وغیرہ۔ اللہ نے انسانی صفات کو ایسے سانچے میں ڈھالا ہے کہ وہ انھیں اچھے اور برے مواقع پر یکساں استعمال کرسکتا ہے، ان سے اچھا اور برا دونوں طرح کا کام لے سکتا ہے۔ چنانچہ انسان کو من جانب اللہ کچھ اصول وضوابط دے کر ان صفات کے استعمال میں آزادی دی گئی ہے، اب چاہے وہ ان کا اچھا استعمال کرے اور جزا کا مستحق ہوجائے اور چاہے تو ان کا غلط استعمال کر کے اپنی دنیا اور آخرت کا نقصان کرلے، چنانچہ انسان کی ایک صفت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ بہت جلد باز واقع ہوا ہے، ارشاد خداوندی ہے: خلق الانسان من عجل:(انبیاء ۲۱/۳۷)، انسان جلد باز مخلوق ہے (یعنی وہ ہر کام میں جلد بازی چاہتا ہے)۔

عجلت پسندی بذات خود کوئی بری چیز نہیں ہے بلکہ بسا اوقات یہ مقصود ومطلوب ہوا کرتی ہے، جیسے کسی گناہ کے ہوجانے کے بعد توبہ میں عجلت مطلوب اور عند اللہ محمود ہے، ارشاد خداوندی ہے: سارعوا الیٰ مغفرۃ من ربکم و جنۃ عرضھا السمٰوات والارض (آل عمران ۱۳۳/۳) اپنے رب کی مغفرت اور اس کی اس جنت کی طرف ایک دوسرے سے جلدی پہنچنے کی کوشش کرو جس کی وسعت آسمان اور زمین کے برابر ہے۔

نماز جمعہ کے تعلق سے بھی جلد بازی کا حکم ہے، ارشاد باری ہے: یا ایھا الذین آمنوا اذا نودی للصلاۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ و ذروا البیع ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون(جمعہ ۹/۶۲) اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن (جمعہ کی) نماز کے لئے اذان دی جائے تو فوراً اللہ کے ذکر کی طرف تیزی سے چل پڑو اور خرید وفروخت کو چھوڑ دو، اگر تم سمجھ رکھتے ہو تو یہ تمہارے لئے بہت نفع کی چیز ہے۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے کار خیر میں پہل کرنے کا حکم دیا ہے، ارشاد نبوی ﷺ ہے: بادروا بالاعمال الصالحۃ(مسلم ۱۶۹) اچھے کام کرنے میں جلدی کیا کرو۔

یہ آیات قرآنی اور احادیث مبارکہ ہمیں بتا رہی ہیں کہ جلد بازی فی نفسہ بری صفت نہیں ہے بلکہ بعض جگہ باعث خیر ہوا کرتی ہے، لیکن کچھ جگہیں ایسی بھی ہیں جہاں عجلت پسندی اللہ کو نہایت ناپسند ہے اور ایسی جگہوں پر اللہ نے انسان کو اپنی اس صفت کو کنٹرول کر کے صبر وتحمل سے کام لینے کا حکم دیا ہے۔

عام طور سے انسان کی عادت ہے کہ وہ سنی سنائی باتوں کی تحقیق کئے بغیر انھیں جلد بازی میں پھیلا دیتا ہے، ہمیں کبھی کوئی ایسی خبر سننے کو ملتی ہے جس کا تعلق ہمارے جذبات سے ہوتا ہے اور اس وقت ہمارا دل بے قابو ہوجاتا ہے اور ہمیں مجبور کرتا ہے کہ جلد از جلد یہ بات دوسروں تک پہنچائیں، اور ہم اپنے جذبات کی رو میں بہہ کر جانچ پڑتال کیے بغیر اسے آگے بڑھا دیتے ہیں جو کبھی کبھار ہمارے

اور دوسرے لوگوں کے لئے ایسی باعث نقصان بن جاتی ہے جس کی تلافی ہم چاہ کر بھی نہیں کر سکتے ۔ قرآن پاک نے بلاتحقیق باتیں پھیلانے سے سختی سے منع کیا ہے، ارشاد خداوندی ہے: یاایھاالذین آمنوا ان جائکم فاسق بنبأ فتبینوا أن تصیبوا قوما بجھالة فتصبحوا علیٰ ما فعلتم نادمین (الحجرت ٦/٦٩) اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی غیر معتبر شخص کوئی خبر لیکر آئے تو اسکی جانچ پڑتال کرلو کبھی تم کسی قوم کو انجانے میں کوئی نقصان پہونچادو اور پھر اپنی اس حرکت پر نظریں اٹھانے کے لائق نہ رہو۔

آپ اپنے اطراف کا جائزہ لیجیے کہ دن بھر میں ہزاروں من گھڑت باتیں بلاتحقیق آگے بڑھادی جاتی ہیں، اور ان کی جانچ پڑتال کے تعلق سے ہم سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے ۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ملک ہندوستان میں ہونے والے بیشتر فسادات انھیں افواہوں کی دین ہیں جو اب تک ہزاروں زندگیاں تباہ کر چکے ہیں۔ یہ تو اجتماعی زندگی کے نقصانات کی ایک جھلک ہے لیکن اگر ہم اپنی انفرادی زندگی کا بھی جائزہ لیں تو گھریلو، معاشرتی اور خاندانی ہر طرح کا نقصان ہماری اس عجلت پسندی کے سبب ہوتا ہے۔

اس لئے آج کل سوشل میڈیا (فیس بک واٹسپ یوٹیوب) استعمال کرنے والوں کی یہ بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ کسی بھی میسج، پوسٹ یا ویڈیو کو بلاتحقیق ہرگز نہ پھیلائیں، ورنہ ہماری یہ نادانی ہمیں اور دوسروں کو کسی نا قابل تلافی نقصان سے دوچار کر سکتی ہے۔

اسی طرح عجلت پسندی جن کاموں میں اللہ کو ناپسند ہے ان میں سے ایک بدگمانی ہے، یعنی کسی کے تعلق سے اپنے دل میں غلط خیال رکھنا، آپ ذرا غور کیجئے یہ بیماری کس قدر ہم میں رچ بس گئی ہے کہ ہمیں اس کی سنگینی کا احساس تک نہیں ہو پاتا، ہم کسی شخص کے کسی ایک عمل کو دیکھ کر بلکہ اس کے متعلق ایک بات سن کر ہی اس سے بدگمان ہو جایا کرتے ہیں، اور پھر اس کے بارے میں اپنا ایک فرضی نظریہ قائم کر کے ساری زندگی اسی نظر سے اسے دیکھا کرتے ہیں، جبکہ اپنے بارے میں ہماری خواہش ہوتی ہے کہ لوگ ہمیشہ ہم سے خوش گمان رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس قدر جلدی گمان قائم کرنے والوں کو سخت نوٹس دیا ہے ارشاد فرمایا؛ یا ایھا الذین امنوا اجتنبوا کثیراً من الظن ان بعض الظن اثم (الحجرات۔ ۱۲/٦٩) اے ایمان والو! زیادہ تر گمانوں سے بچو، کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ بدگمانی انسانی معاشرے کا وہ ناسور ہے جو آہستہ آہستہ محبتوں کو ختم کر کے نفرتوں کو جنم دیتا ہے، اسی لئے نبی اکرم ﷺ نے اس سے بچنے کا سختی سے حکم دیا، فرمایا: ایاکم و الظن فان الظن اکذب الحدیث (بخاری) نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا، تم لوگ برے گمانوں سے بچتے رہو، کیونکہ بدگمانی سے بڑھ کر کوئی جھوٹی بات نہیں ہے۔

ہمیشہ یاد رکھئے اپنے کسی بھی بھائی بہن کے تعلق سے فوراً بدگمان ہونے سے بچیئے، پہلے اچھی طرح اس کو پرکھ لیجئے بہت ممکن ہے کہ آپ خود ہی غلطی پر ہوں، آپ خود سوچئے کیا آپ اس بات کو گوارا کریں گے کہ کوئی آپ کی ناکردہ خطا پر آپ سے بدگمان ہو جائے؟ تو پھر یہی معیار ہم اپنے ہی بھائی کے سلسلے میں کیوں نہیں رکھتے؟

چنانچہ علماء فرماتے ہیں، دل کا سکون اور زندگی کی حقیقی خوشی چاہتے ہو تو اپنے بھائیوں کے ساتھ حسن ظن رکھنا سیکھو، کیونکہ بدگمانی کرنے والے سے ذہنی سکون چھین لیا جاتا ہے۔

ہمارے اس مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو اپنی ودیعت کردہ صفات کا استعمال مثبت انداز سے کرنا چاہئے، اس لئے اچھے اور نیک کاموں میں جلد بازی سے کام لیجئے، اور جن جگہوں پر اللہ نے ہمیں عجلت پسندی کو قابو میں کرنے کا حکم دیا ہے، جیسے سنی سنائی باتوں کو بلا تحقیق پھیلانا، کسی کے تعلق سے برا گمان کرنا، اور بے جا غصہ سے کام لینا ان جیسی جگہوں پر نہایت صبر و تحمل سے قدم اٹھایا کیجئے ، جلد ہی آپ دیکھیں گے کہ ایک پرسکون اور خوشگوار معاشرہ وجود میں آچکا ہے۔ ہم چاہیں تو خود کو آج سے ہی بدل سکتے ہیں کیونکہ اگر ہم کچھ کرنے کی ٹھان لیں تو ہمیں بھلا کون روک سکتا ہے؟

☆☆☆

❑ اصلاحیات

جدید انسان کی مذہب بیزاری، نقصانات اور حل

محمد شعیب ندوی
اسکالر: ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ

گزشتہ دوصدیوں میں سائنس نے نہایت تیزی کے ساتھ ترقی کی ہے۔اس نے نت نئی اکتشافات وایجادات کی ہیں کائنات کے بارے میں بعض ایسی دریافتیں پیش کی ہیں جن کی طرف قرآن نے چودہ سو برس پہلے ہی اشارہ کردیا تھا جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ (حم سجدہ ۵۳)۔

عنقریب ہم انہیں اپنی نشانیاں آفاق عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی اپنی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ حق یہی ہے۔

ایسی ایسی مشینیں ایجاد کی ہیں جنکی وجہ سے انسان نہایت آرام پسند ،عیش وعشرت کا عادی ہوگیا ہے۔طبیعیات ونفسیات کے شعبہء جات میں ایسے تجربات دنیا کے سامنے پیش کئے ہیں جن سے دنیا حیران وششدر ہوگئی ہے۔مگر افسوس ہے کہ اس سلسلہ وار علمی وسائنسی ارتقاء کی تشریح وتوجیہ نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مذہب وخدانام کی کسی چیز کا وجود نہیں ہے بلکہ گزشتہ ایام کے لوگ جو توجیہات مذہب وخدا کے اثبات کی کرتے تھیں وہ اپنی جہالت وناواقفیت کی بناء پر انکے اثبات کا عقیدہ رکھتے تھے۔یہ دور علمی ترقی کا دور ہے اس نے کائنات کیسے وجود میں آئی اسکے اسباب ووسائل کو دریافات کرلیا ہے۔لہذا اب آباءواجداد کی توجیہات سے ماوراء ہوکر مطلق حریت کے ساتھ زندگی بسر کرو، اپنی خواہشات کو جس طرح چاہو پوری کرو۔

اس نظریہ نے اس سرعت کے ساتھ ترقی کی کہ آج کا دور الحاد ودہریت کے دور میں منتقل ہوگیا۔اس دور نے یہ علمی دعوی کیا کہ کائنات کا وجود خود سے ہوا ہے، اس کا کوئی موجد نہیں لیکن ان نظریات وتصوارات میں تضاد نظر آتا ہے۔ایک طرف تو وہ دنیا کو اس طرح مذہب بیزاری ،اور انکار خدا کا تصور دیتے ہیں، دوسری طرف جب جدید مفکرین کائنات میں تدبر کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں یہ بات بالکل واضح طور پر آتی ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی موجد ہے۔ جیسے ہی یہ خیال آتا ہے فوراً اس کو رفع کرتے ہیں اور اپنے سابقہ نظریہ پر قائم رہنے کیلئے دل کو جھوٹی تسلی دیتے ہیں، خود اسکی تصریحات انکی زبانی موجود ہیں۔اثبات خدا کی تصریحات جدید مفکرین کچھ اس طرح کرتے ہیں: انڈریو کان وے لکھتا ہے کہ ''یہ قول کہ خدا موجود ہے اس کو جھٹلایا نہیں جاسکتا اور یہ دعوی کہ خدا نہیں ہے اسکو ثابت نہیں کیا جاسکتا ،کارل مارکس اور لینن کی طرح بہت سے ملحدین نے باری تعالی کے وجود کی نفی تو کی ہے لیکن اس کے انکار کے لئے وہ آج تک کوئی عقلی ثبوت فراہم نہ کرسکے،مزید فرماتے ہیں کہ موجودہ فکری دنیا پر مغرب کی حکومت ہے اور مغرب فلسفہء الحاد کا امام ہے''۔

پروفیسر ایڈون ماہر حیاتیات نے اکثر کہا ہے کہ'' کائنات کا بطور حادثہ وقوع پذیر ہوجانا ایسا ہی ہے جیسے ایک پریس میں دھماکہ ہوجائے اور ایک ضخیم لغت کا تیار ہوجانا''۔ایک انگریز مفکر فرانس

بیکن بیان کرتا ہے کہ ”فلسفے کا سطحی مطالعہ انسان کو الحاد کی طرف لے جاتا ہے لیکن اسی فلسفے کی گہرائیوں میں اترے تو مذہب کا قائل ہوجاتا ہے“۔ ایک مفکر کریسی ماریسن مذہب وخدا کے اثبات کی اچھائیاں اور مذہب بیزاری کے نقصانات کی نشاندہی یوں کرتا ہے کہ ادب واحترام، کردار کی بلندی، اخلاق، اعلے خیالات اور سب کچھ جس کو خدائی صفات کہا جاسکتا ہے۔ وہ کبھی الحاد سے پیدا نہیں ہوسکتیں جو کہ دراصل خود بینی کی عجیب وغریب قسم ہے۔ جسمیں آدمی خود اپنے آپ کو خدا کے مقام پر بٹھالیتا ہے عقیدے اور یقین کے بغیر تہذیب تباہ ہوجائے گی، نظم، بے نظمی میں تبدیل ہوجائے گا، ضبط نفس اور اپنے آپ پر کنٹرول کا خاتمہ ہوجائے گا اور برائی ہر طرف پھیل جائے گی، ضرورت ہے کہ ہم خدا پر اپنے یقین کو دوبارہ مضبوط کریں“۔

بہرحال جدید مفکرین نے اسی نظریہ الحاد کو بنیاد بنا کر اپنی تہذیب وتمدن، معاشرتی وعائلی، سیاسی واقتصادی قوانین کو وضع کیا ہے، مذہب اور خدا پر طرح طرح کے اعتراضات کرکے اسکو پراگندہ کرنے کی کوشش کی ہے اور کی جارہی ہے۔ مزید برآں اپنی ناقص تہذیب وثقافت، سیاست وقانون، نظریہء معاشرت ومعیشت کو دنیا پر تھوپنے کی پیہم جدوجہد جاری ہے۔ حالانکہ انکے تجربات ومشاہدات کی بناء پر جو نظام زندگی قائم کیا گیا تھا اسکے نقصانات ومشکلات میں یہ جدید مفکرین، منکرین خدا خود جکڑے ہوئے ہیں۔ ان کے مروجہ نظام حیات کو ان ہی کے ممالک سے جس سرعت کے ساتھ ملک بدر کیا جارہا ہے اس کا اندازہ مشکل ہے۔ عوام پر اس نظام کے بے انتہا ظالمانہ اثرات ظاہر ہورہے ہیں۔ فطرت سے بغاوت کرکے تسکین دل کیلئے تفریحات، مختلف گیمز، کامیڈی مصنوعی Loughter show وغیرہ کا رواج عروج پر ہے، عائلی زندگی کا خاتمہ ہورہا ہے، تہذیبوں کا تصادم ہورہا ہے، جرائم میں اضافہ ہورہا ہے، ناجائز اولاد کا کثرت سے وجود ہورہا ہے، یہ اس تہذیب وتمدن کے ثمرات ہیں جس کی حقیقت سے اکثر لوگ ناآشنا ہیں، اسی میں ترقی کا راز پنہاں سمجھ رہے ہیں۔

اس صورت حال میں انسان کی ذاتی شخصیت کا عقلی وتخلیقی جائزہ لیتے ہیں، خالق کائنات نے انسان کو وجود بخشا، اس کے اندر خیر وشر کے درمیان تمیز کرنے کی فطری قوت ودیعت فرمائی، تاکہ انسان اپنے عقل ودماغ کی مدد سے انسانیت نواز بن جائے، جس کو قرآن میں یوں بیان کیا ہے؛ فطرۃ الله التی فطر الناس علیها ؛ لیکن مدبر کائنات نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس پر اتمام حجت، اس کی رشد وہدایت کے لئے، اپنے احکام وضوابط کی اس تک رسائی کیلئے، دنیا میں ان کے نفاذ کے لئے سلسلہ وار انبیاء مبعوث فرمائے جب کبھی انسان کج روی کا شکار ہوا الٰہی نمائندہ اس کی ہدایت ورہنمائی کیلئے آیا۔ چناچہ یہ بعثت کا سلسلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین، آپ پر نازل شدہ کتاب بھی آخری کتاب ہے، یہی دستور الٰہی ابدی وسرمدی ہے، اس کی تعلیمات دائمی ہیں اس کے احکامات فطرت کے عین مطابق ہیں، وہی عالم کے امن واستقرار، صلح وآشتی کے ضامن ہیں، صالح معاشرہ کی تشکیل اس کے بغیر ہرگز نہیں ہوسکتی، تہذیب وتمدن ان تعلیمات سے بیزاری کے بعد فلاح وبہبود نہیں پاسکتے، ثقافت وتعلیم اسکے بغیر ناقص رہتی ہے، اس کی تعلیمات کی روشنی میں زندگی بسر کرنا ہی بقا ودوام کا ضامن ہے ورنہ فطرت سے بغاوت کا نتیجہ فنا ہے، ارشاد ربانی ہے؛ وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم.

اللہ تعالی نے اپنی کتاب میں کائنات کے ایسے ایسے اسرار ورموز کی طرف اشارہ کیا ہے جس کو آج جدید مفکرین اپنی ایجاد کہتے ہیں۔ یسے ایسے اکتشافات وایجادات، نظم ونسق کو واضح الفاظ میں بیان کیا ہے؛ اللّٰهُ الَّذِي رَفَعَ السَّمَاوَاتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوَى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُّسَمًّى يُدَبِّرُ الْأَمْرَ يُفَصِّلُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُم بِلِقَاءِ رَبِّكُمْ توقنون (الرعد:۲)

اللہ وہی ہے جس نے آسمان کو بغیر ستونوں کے بلند کر رکھا ہے کہ تم اسے دیکھ رہے ہو پھر وہ عرش پر قرار پکڑے ہوئے ہے اسی نے سورج اور چاند کو ماتحتی میں لگا رکھا ہے۔ ہر ایک میعاد معین پر گشت کر رہا ہے وہی کام کی تدبیر کرتا ہے، وہ اپنے نشانات کھول کھول کر بیان کر رہا ہے کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرلو۔ إِنَّ اللّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَى يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ذَلِكُمُ اللّهُ فَأَنَّى تُؤْفَكُونَ(الانعام:۹۵) بے شک اللہ تعالی دانہ کو اور گٹھلیوں کو پھاڑنے والا ہے، وہ جاندار کو بے جان سے نکال لاتا ہے، اور وہ بے جان کو جاندار سے نکالنے والا ہے اللہ تعالی یہ ہے سو تم کہاں الٹے چلے جارہے ہو۔

اگر منصف مزاج جدید مفکرین تعصب وحجود سے اوپر اٹھ کر کائنات میں غور وفکر اور تدبر سے کام لیں تو وہ اس حقیقت کے اعتراف سے دست بردار نہیں ہوسکتے کہ اس کائنات کے پس پردہ کوئی ذات فعال ومحرک ہے۔ کیونکہ کائنات خود خدا کی گواہی دیتی ہے، اس کا بے مثل نظام فلکیات، اس میں موجود کہکشائیں، نجوم وکواکب، شمس وقمر کی منظم گردش اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اسکا کوئی موجد ومدبر ہے۔ قرآن میں بیان کردہ ارضیات وغذائیات کا نظم ونسق، انسان کے لئے اس کو مفید سے مفید تر بنانا، ان کا توازن برقرار رکھنا، ان میں پائی جانے والی گیسس وحرارت کو برقرار رکھنا، زمین میں پہاڑوں کو جمانا تا کہ یہ زمین کے توازن کو برقرار رکھیں، آب پاشی کا ضابطہ الہی، ابحار وانہار کا قیام، بارش کا انتظام، مہلک اغذیاء سے انسان کو متنبہ کرنا، مفید کی ترغیب دلانا، زمین میں درختوں کو اگانا، زراعت وکاشتکاری کو بڑھانا، دن ورات کی آمد ورفت، یہ تمام کسی نہ کسی ذات کے نظم ونسق کے حکم پر اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ جس سے یہ حقیقت آشکارا ہوجاتی ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی مبدع ومدبر ہے .اور وہ خالق ازلی ہے۔ سائنسداں کائنات کو تو ازلی مانتے ہیں لیکن خدا کو ازلی ماننے کے تمام ثبوت وشواہد واضح ہوجانے کے بعد بھی اس بناء پر انکار کردیتے ہیں کہ خالق کو ازلی ماننا پڑے گا جس کی وجہ سے وہ کائنات ہی کو ازلی قرار دیتے ہیں۔ یہ صرف ان کے رجحانات ونظریات، مشاہدات وتجربات کے جانبدارانہ رویہ اختیار کرنے کی وجہ سے ہے کیونکہ انکی تمام تحقیقات وتدقیقات ابھی ناقص ہیں، فطرت کے اسرار ورموز سے بالاستیعاب متعارف ہونے کیلئے انسانوں کی عمریں اور ان کے موجودہ وسائل ناکافی ہیں جسکو قرآن میں یوں بیان کیا ہے: قُل لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَاداً لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مدد (الكهف ۱۰۹) کہہ دیجئے کہ اگر میرے پروردگار کی باتوں کے لکھنے کیلئے سمندر سیاہی بن جائے تو وہ بھی میرے رب کی باتوں کے ختم ہونے سے پہلے ہی ختم ہوجائیگا گو ہم اسی جیسا اور بھی اس کی مدد میں لے آئیں۔

اس کا واحد حل صرف یہ ہے کہ انسان نے جس چیز سے انحراف کیا تھا اس کی طرف دوبارہ رجوع کرے، فطرت سے بغاوت کے بجائے ہم آہنگی پیدا کرے، اس کے بتائے ہوئے راستہ پر گامزن ہو جائے، خدا کا صراط مستقیم اس کے سامنے ہے، اس پر چلنے کی کوشش کرے خدا کے رسول پر ایمان لائے۔ خدائی کتاب کو دستور حیات بنائے، اور آخرت کی تیاری میں لگ جائے، زیادہ پیچ وخم میں پڑے گا مزید الجھتا جائیگا، کیونکہ وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا(الاسراء:۸۵) اور تمہیں بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔ ہمارے علم کی مقدار کائنات کے بارے میں ناقص ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ اس دور الحاد کی تیز وتند ہواؤں سے ہم اپنے آپ کو محفوظ رکھیں۔

مزید تفصیل کے لیے مندرجہ ذیل کتب ملاحظہ کریں:

(۱)۔Evidence of God in anex panding uniberse

(۲) علم جدید کا چیلنج، مولانا وحیدالدین خاں

(۳) خدا اور رسول کا تصور، مولانا سید جلال الدین عمری

(۴) فطرت کے راز، بدیع الزماں سعید نورسی، ترجمہ ثناء اللہ شاہین

☆☆☆

آخری صفحہ

تو میں یہ کتاب اس کے نام منسوب کرتا

(م۔ق۔ن)

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی تفسیر ''ترجمان القرآن'' کے انتساب میں لکھا ہے کہ ''غالباً دسمبر ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے کہ میں رانچی میں نظر بند تھا۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہوکر مسجد سے نکلا تو مجھے محسوس ہوا کہ کوئی شخص پیچھے آرہا ہے۔ مڑکر دیکھا تو ایک شخص کمبل اوڑھے کھڑا تھا۔ ''آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟'' ''ہاں جناب بہت دور سے آیا ہوں'' ''کہاں سے ؟'' ''سرحد پار سے'' ''یہاں کب پہنچے؟'' آج شام کو پہنچا، میں بہت غریب آدمی ہوں، قندھار سے پیدل چل کر کوئٹہ پہنچا، وہاں چند ہم وطن سوداگر مل گئے تھے۔ انھوں نے نوکر رکھ لیا اور آگرہ پہنچا دیا۔ آگرہ سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں''۔ ''افسوس.....! تم نے اتنی مصیبت کیوں برداشت کی؟'' ''اس لئے کہ آپ سے قرآنِ مجید کے بعض مقامات سمجھ لوں۔ میں نے الہلال اور البلاغ کا ایک ایک حرف پڑھا ہے''۔ یہ شخص چند دنوں تک ٹھہرا اور پھر یکا یک واپس چلا گیا۔ وہ چلتے وقت اس لئے نہیں ملا کہ اسے اندیشہ تھا، میں اسے واپسی کے مصارف کے لیے روپیہ دوں گا، اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا بار مجھ پر ڈالے۔ اس نے یقیناً واپسی میں بھی مسافت کا بڑا حصہ پیدل طے کیا ہوگا۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن اگر میرے حافظے نے کوتاہی نہ کی ہوتی تو میں یہ کتاب اس کے نام منسوب کرتا''۔

اس ''انتساب'' کو غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے اور پھر اپنا محاسبہ کرنا ہے کہ آج ہم مسلمان مسلمانی کا دعویٰ کرنے کے بعد کس موڑ پر کھڑے ہیں۔ کیا ہم نے کبھی قرآنِ کریم میں غوطہ زن ہوکر اس کے رموز و اسرار پانے کی کوشش کی۔؟ کیا ہماری نوجوان نسل شعورِ قرآنی کو حاصل کرنے کی خواہاں ہے؟ کیا ملت اسلامیہ کے مرد و خواتین میں قرآن کو صحیح پڑھنے اور قرآنی مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت ہے؟ کیا ہم میں قرآن کو سمجھنے کی ویسی تڑپ ہے جس نے مولانا آزادؒ کو بھی تڑپاتے ہوئے ترجمان القرآن کا انتساب لکھنے پر قلم کو مجبور کر دیا۔ آیئے..... ہم سب طے کریں کہ قرآن کو صحت تلفظ کے ساتھ پڑھیں گے، اس کے اسرار و معانی تک رسائی کی کوشش بھی کریں گے، کیوں کہ اس عظیم کتاب کو بغیر ماہر استاذ اور صاحب بصیرت عالم کے سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ جو شخص قرآن مجید کے معانی اور مفاہیم کو اور اس کے اسرار و رموز اور احکام و مسائل کو بغیر استاذ اور مربی کے پڑھے گا اور اپنے ذاتی فہم سے قرآن فہمی کی کوشش کرے گا وہ جگہ جگہ ٹھوکر کھائے گا، سلف کی تفسیر سے ہٹ کر جس نے بھی اپنی رائے قرآنی آیات کو سمجھنے میں لگائی اور اپنے من سے تفسیر کی، اس نے غلط تفسیر کی، اور کیوں نہ ہو کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص اپنے من سے قرآن کی تفسیر کرے وہ بے راہ روی کا شکار ہو جائے گا۔

☆☆☆